دو ہاتھ

عصمت چغتائی

qasarulkutub.blogspot.com

فہرست

دو ہاتھ	۷
پیار	۲۰
بے کار	۳۰
بچھو پھوپی	۴۱
کلو کی ماں	۵۲
نیند	۶۲
کنواری	۷۵
چوتھی کا جوڑا	۹۲
چٹان	۱۰۸
"عشق پر زور نہیں......"	۱۲۴

qasarulkutub.blogspot.com

دو ہاتھ

رام اوتار لام پر سے واپس آ رہا تھا۔ بوڑھی مہترانی اَبّا میاں سے چٹھی پڑھوانے آئی تھی۔ رام اوتار کو چھٹی مل گئی۔ جنگ ختم ہو گئی تھی نا! اس لئے رام اوتار تین سال بعد واپس آ رہا تھا۔ بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹما رہے تھے، مارے شکر گذاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی۔ جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوا لیا۔

بڑھیا پچاس برس کی ہو گی، پر ستر کی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ کچے پکے بچے جنے۔ اُن میں سے بس رام اوتار ہی بڑی منتوں مرادوں سے جیا تھا۔ ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر بھی نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آ گئی۔ مہترانی نے بہت واویلا مچایا، مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اُس کے پیر چھونے آیا تو اُس کی شان و شوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئی۔ جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے۔ رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے کی امید تھی، سب اسی پر آس لگائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ رام اوتار لام پر توپ، بندوق چھوڑنے نہیں لگا تھا، پھر بھی سپاہیوں کا میلا اُٹھاتے اُٹھاتے اُس میں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہو گئی۔ بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پرانا رام اوتار واقعی نہ رہا ہو گا۔ ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت سُنے اور اُس کا جوان خون ہتک سے کھول نہ اُٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے تو کیا مسمسی تھی گوری۔ جب رام اوتار رہا اُس کا گھونگھٹ فٹ بھر لمبا رہا اور کسی نے اس کے رُخ پر نور کا جلوہ نہ دیکھا۔ جب خصم گیا تو کیا بلک بلک کر روئی تھی۔ جیسے اُس کی مانگ کا سیندور ہمیشہ کے لئے اُڑ رہا ہو۔ تھوڑے دن روئی روئی آنکھیں لئے۔ سر جُھکائے میلے کی ٹوکری ڈھوتی پھری۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے گھونگھٹ کی لمبائی کم ہونے لگی۔

qasarulkutub.blogspot.com

کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ سارا بسنت رُت کا کیا دھرا ہے۔ کچھ صاف گو کہتے تھے۔ گوری تھی ہی چھنال۔ رام اوتار کے جاتے ہی قیامت ہو گئی۔ کمبخت ہر وقت ہی ہی، ہر وقت اٹھلاتی۔ کمر پہ میلے کی ٹوکری لے کر کانسے کے کڑے جھنکاتی جدھر سے نکل جاتی لوگ بدحواس ہو جاتے۔ دھوبی کے ہاتھ سے صابن کی بٹی پھسل کر حوض میں گر جاتی۔ باورچی کی نظر توے پر سلگتی ہوئی روٹی سے اُچٹ جاتی۔ بہشتی کا ڈول کنویں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ چپراسیوں تک کی بلا لگی پگڑیاں ڈھیلی ہو کر گردن میں جھولنے لگتیں۔ اور جب یہ سراپا قیامت گھونگھٹ میں سے بان پھینکتی گزر جاتی تو پورا شاگرد پیشہ ایک بے جان لاش کی طرح سکتے میں رہ جاتا۔ پھر ایک دم چونک کر وہ ایک دوسرے کی دُرگت پر طعنہ زنی کرنے لگتے۔ دھوبن مارے غصّے کے کلف کی کونڈی اوندھا دیتی۔ چپراسن چھاتی سے چمٹے لونڈے کے بے بات دھموکے جڑنے لگتی اور باورچی کی تیسری بیوی پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ جاتا۔

نام کی گوری تھی۔ پر کمبخت سیاہ بہت تھی۔ جیسے اُلٹے توے پر کسی پھوہڑ نے پراٹھے تل کر چکنا ہاتھ چھوڑ دیا ہو۔ چوڑی پھکنا سی ناک، پھیلا ہوا دہانہ، دانت مانجھنے کا اُس کی سات پُشت نے فیشن ہی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں میں پلیوں کاجل تھوپنے کے بعد بھی داہنی آنکھ کا بھینگا پن اوجھل نہ ہو سکا۔ پھر بھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ جانے کیسے زہر میں بجھے تیر پھینکتی تھی کہ ان نے پر بیٹھ ہی جاتے تھے۔ کمر بھی لچکدار نہ تھی، خاصی کٹھلا سی تھی۔ جھوٹن کھا کھا کر دُنبہ ہو رہی تھی۔ چوڑے بھینس کے سے کھُر جدھر سے نکل جاتی کڑوے تیل کی سڑاند چھوڑ جاتی۔ ہاں آواز میں بلا کی کوک تھی۔ تیج تیوہار پر لہک کر کجریاں گاتی تو اُس کی آواز سب سے اونچی لہراتی چڑھتی چلی جاتی۔

بڑھیا مہترانی، یعنی اس کی ساس بیٹے کے جاتے ہی اس سے بے طرح بدگمان ہو گئی۔ بیٹھے بٹھائے احتیاطاً گالیاں دے دیتی۔ اس پر نظر رکھنے کے لئے پیچھے پیچھے پھرتی، مگر بڑھیا اب ٹوٹ چکی تھی، چالیس برس میلا ڈھونے سے اُس کی کمر مستقل طور پر ایک طرف لچک کر وہیں تھم گئی تھی۔ ہماری پرانی مہترانی تھی۔ ہم لوگوں کے آنول نال اسی نے گاڑے تھے۔

جوں ہی امّاں کے درد لگتے۔ مہترانی دہلیز پر آ کر بیٹھ جاتی اور بعض وقت لیڈی ڈاکٹر تک کو نہایت مفید ہدایتیں دیتی۔ بلائیات کو دفع کرنے کے لئے کچھ منتر تعویذ بھی لا کر پٹی سے باندھ دیتی۔ مہترانی کی گھر میں خاصی بزرگانہ حیثیت تھی۔

اتنی لاڈلی مہترانی کی بہو یکایک لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن گئی۔ چپراسن اور باورچن کی تو بات اور تھی۔ ہماری اچھی بھلی بھاوجوں کا ماتھا اُسے اٹھلاتے دیکھ کر ٹھنک جاتا۔ اگر وہ اس کمرے میں جھاڑو دینے جاتی جس میں اُن کے میاں ہوتے تو وہ ہڑبڑا کر دودھ پیتے بچے کے مُنہ سے چھاتی چھین کر بھاگتیں کہ کہیں وہ ڈائن اُن کے شوہروں پر ٹونا ٹوٹکا نہ کر رہی ہو۔

گوری کیا تھی بس ایک مرکھنا لمبے لمبے سینگوں والا بجار تھا کہ چھوٹا پھرتا تھا۔ لوگ اپنے کانچ کے برتن بھانڈے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلیجے سے لگاتے اور جب حالات نے نازک صورت پکڑ لی تو شاگرد پیشے کی مہیلاؤں کا ایک باقاعدہ وفد اماں کے دربار میں حاضر ہوا۔ بڑے زور شور سے خطرہ اور اُس کے خوفناک نتائج پر بحث ہوئی۔ پتی رکھشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں سب بھاوجوں نے شد و مد سے ووٹ دیئے اور اماں کو صدر اعزازی کا عہدہ سونپا گیا۔ ساری خواتین حسبِ مراتب زمین، پیڑھیوں اور پلنگ کی ادوائن پر بیٹھیں۔ پان کے ٹکڑے تقسیم ہوئے اور بڑھیا کو بلایا گیا۔ نہایت اطمینان سے بچوں کے منہ میں دودھ دے کر سبھا میں خاموشی قائم کی گئی۔ اور مقدمہ پیش ہوا۔

"کیوں ری چڑیل! تو نے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہماری چھاتیوں پہ کودوں دلے۔ ارادہ کیا ہے تیرا۔ کیا مُنہ کالا کرائے گی؟"

مہترانی تو بھری ہی بیٹھی تھی، پھوٹ پڑی۔ "کیا کروں بیگم صاحب حرام خور کو چار چوٹ کی مار بھی دیئے کہ روٹی بھی کھانے کو نا دیئی۔ پر رانڈ میرے تو بس کی نہیں۔"

"ارے روٹی کی کیا کمی ہے اُسے"، باورچن نے اینٹھا پھینکا۔ سہد پور کی خاندانی باورچن اور پھر تیسری بیوی۔ کیا نبہا تھا کہ اللہ کی پناہ! پھر چپراسن، مالن

qasrulilmutub.blogspot.com

اور دھوبن نے مقدمہ کو اور سنگین بنا دیا۔ بیچاری مہترانی بیٹھی سب کی لتاڑ سنتی اور اپنی خارش زدہ پنڈلیاں کھجلاتی رہی۔

"بیگم صاحب آپ جیسی بتاؤ ویسے کرنے سے موئے نا تھوڑی ہی، پر کا کروں کا رانڈ کا ٹینٹوا دبائے دیوں۔۔۔؟"

ٹینٹوا دینے کے حسین خیال سے بیبیاؤں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور سب کو بڑھیا سے بے انتہا ہمدردی پیدا ہو گئی۔

اماں نے رائے دی۔۔۔ "موئی کو میکے پھنکوا دے۔"

"اے بیگم صاحب، کہیں ایسا ہو سکے ہے؟" مہترانی نے بتایا کہ بہو مفت ہاتھ نہیں آئی ہے۔ ساری عمر کی کمائی پورے دو سو جھونکے ہیں تب مسٹنڈی ہاتھ آئی ہے۔ اتنے پیسوں میں تو دو گائیں آجاتیں۔ مزے سے بھر کلسی دودھ دیتیں۔ پر یہ رانڈ تو دولتیاں ہی دیتی ہے۔ اگر اسے میکے بھیجد یا گیا تو اس کا باپ اسے فوراً دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دے گا۔ بہو صرف بیٹے کے بستر کی زینت ہی تو نہیں، دو ہاتھ والی ہے۔ چار آدمیوں کا کام نپٹاتی ہے۔ رام اوتار کے جانے کے بعد بڑھیا سے اتنا کام کیا سنبھلتا۔ یہ بڑھاپا تو اب بہو کے دو ہاتھوں کے صدقے میں بیت رہا ہے۔

بیبیاں کوئی ناسمجھ نہیں۔ معاملہ اخلاقیات سے ہٹ کر اقتصادیات پر آگیا تھا۔ واقعی بہو کا وجود بڑھیا کے لئے لازمی تھا۔ دو سو روپے کا مال کس کا دل ہے کہ پھینک دے۔ ان دو سو کے علاوہ بیاہ پر جو بنیئے سے لیکر خرچ کیا تھا، جگمان کھلائے تھے، برادری کو راضی کیا تھا۔ یہ سارا خرچہ کہاں سے آئے گا۔ رام اوتار کی جو تنخواہ ملتی تھی، وہ ساری اُدھار میں ڈوب جاتی تھی۔ ایسی موٹی تازی بہو اب تو چار سو سے کم میں نہ ملے گی۔ پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اور آس پاس کی چار کوٹھیاں نمٹاتی ہے۔ رانڈ کام میں چوکس ہے ویسے۔

پھر بھی اماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ "اگر اس لچی کا جلد از جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو کوٹھی کے احاطہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔"

بڑھیا نے بہت واویلا مچائی۔ اور جا کر بہو کو منہ بھر بھر کر گالیاں دیں۔ جھونٹے پکڑ کر مارا، پیٹا بھی۔ بہو اُس کی زرخرید تھی۔ پٹتی رہی، بڑبڑاتی رہی اور دوسرے دن انتقاماً سارے محلے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باورچی، بہشتی، دھوبی اور چپراسیوں نے تو اپنی بیویوں کی مرمت کی۔ یہاں تک کہ بہو کے معاملہ پر میری مہذب بھابیوں اور شریف بھائیوں میں بھی کھٹ پٹ۔ اور بھابیوں کے میکے تار جانے لگے۔ غرض بہو ہرے بھرے خاندان کیلئے سوئی کا کانٹا بن گئی۔

مگر دو چار دن کے بعد بوڑھی مہترانی کے دیور کا لڑکا رتی رام اپنی تائی سے ملنے آیا۔ پھر وہیں رہ پڑا۔ دو چار کوٹھیوں میں کام بڑھ گیا تھا سو وہ بھی اُس نے سنبھال لیا۔ اپنے گاؤں میں آوارہ ہی تو گھومتا تھا۔ اُس کی بہو ابھی نابالغ تھی۔ اس لئے گونا نہیں ہوا تھا۔

رتی رام کے آتے ہی موسم ایک دم لوٹ پوٹ کر بالکل ہی بدل گیا۔ جیسے گھنگھور گھٹائیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تتر بتر ہو گئیں۔ بہو کے قہقہے خاموش ہو گئے۔ کانسے کے کڑے گونگے ہو گئے۔ اور جیسے غبارے سے ہوا نکل جائے تو وہ چپ چاپ جھولنے لگتا ہے۔ ایسے بہو کا گھونگھٹ جھولتے جھولتے نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب وہ بجائے بے نتھے بیل کے نہایت شرمیلی بہو بن گئی۔ جملہ بیبیاؤں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسٹاف کے مردوے اُسے چھیڑتے بھی تو وہ چھوئی موئی کی طرح لجا جاتی اور زیادہ آنکھ دکھاتے تو وہ گھونگھٹ میں سے بھینگی آنکھ کو اور ترچھا کر کے رتی رام کی طرف دیکھتی جو فوراً بازو کھجلاتا سامنے آ کر ڈٹ جاتا۔ بڑھیا پرسکون انداز میں دہلیز پر بیٹھی ادھ کھلی آنکھوں سے یہ طربیہ ڈرامہ دیکھتی اور گڑگڑی پیا کرتی۔ چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا۔ جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو۔

مگر اب کے بہو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہو گیا۔ اور وہ محلے کی مرد جاتی پر مشتمل تھا۔ بات بے بات باورچی جو اُسے پراٹھے تل کر دیا کرتا تھا کونڈی صاف نہ کرنے پر گالیاں دینے لگا۔ دھوبی کو شکایت تھی کہ وہ کلف لگا کر کپڑے رکھتی ہے پر ڈالتا ہے۔ یہ حرامزادی خاک اُڑانے آجاتی ہے۔ چپراسی مرد اپنے بیل دس دس

daasarulkutub.blogspot.com

مرتبہ جھاڑو دلواتے پھر بھی وہاں کی غلاظت کا رونا روتے رہتے۔ بہشتی جو اس کے ہاتھ دھلانے کیلئے کئی مشکیں لئے تیار رہتا تھا، اب گھنٹوں صحن میں چھڑکاؤ کرنے کو کہتی۔ مگر بالتا دیتا تاکہ وہ سوکھی زمین پر جھاڑو دے تو پھر اسی گرد اُڑانے کے جرم میں اُسے گالیاں دے سکے۔

مگر بہو سر جھکائے سب کی ڈانٹ پھٹکار ایک کان سنتی دوسرے کان اُڑا دیتی۔ نہ جانے ساس سے کیا جا کر کہہ دیتی کہ وہ کان کا بوجھ کر کے سب کا بھیجا چاٹنے لگتی۔ اب اُس کی نظر میں بہو نہایت بدمعاش اور بدچلن ہو چکی تھی۔

پھر ایک دن داڑھی والے درو غہ جی جو تمام نوکروں کے سردار تھے اور ابا کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے۔ ابا کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے اور اس بھیانک بدمعاشی اور غلاظت کا رونا رونے لگے جو بہو اور رتی رام کے ناجائز تعلقات سے سارے شاگرد پیشے کو گندہ کر رہی تھی۔ ابا نے معاملہ سیشن سپرد کر دیا۔ یعنی اماں کو پکڑا دیا۔ مہیلاؤں کی سبھا پھر سے جُڑی اور بُڑھیا کو بُلا کر اُس کے سنتے لئے گئے۔

"اری نگوڑی خبر بھی ہے یہ تیری بہو قطامہ کیا گُل کھلا رہی ہے؟"

مہترانی نے ایسے چندھرا کر دیکھا جیسے کچھ نہیں سمجھتی غریب کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے، اور جب اُسے صاف صاف بتا یا گیا کہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ بہو اور رتی رام کے تعلقات نازیبا حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ دونوں بہت ہی قابلِ اعتراض حالتوں میں پکڑے گئے ہیں تو اُس پر بُڑھیا بجائے اپنی بہتری چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہت چراغ پا ہوئی۔ بڑی واویلا مچانے لگی کہ رام اوتار ہوتا تو ان لوگوں کی خبر لیتا جو اُس کی معصوم بہو پر تہمت لگاتے ہیں۔ بہو نگوڑی تو اب چُپ چاپ رام اوتار کی یاد میں آنسو بہایا کرتی ہے۔ کام کاج بھی جان توڑ کر کرتی ہے۔ کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ ٹھٹھول بھی نہیں کرتی۔ لوگ اس کے ناحق دشمن ہو گئے ہیں۔ بہت سمجھایا مگر وہ ماتم کرنے لگی کہ ساری دُنیا اس کی جان کی

لاگو ہو گئی ہے۔ آخر بُڑھیا اور اُس کی معصوم بہو نے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ وہ تو سب کی رازدار ہے آج تک اُس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا اُسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے۔ کوٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا؟ مہترانی سے کسی کا میلا نہیں چھپتا۔ ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کئے ہیں۔ یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت الٹ دیں۔ پر نہیں۔ اُسے کسی سے بغض نہیں۔ اگر اُس کے گلے پر چھُری دبائی گئی تو شاید غلطی ہو جائے ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

اُس کا یہ تیہا دیکھ کر فوراً چھُری دبانے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ساری مہیلائیں اُس کی ہاں میں ہاں کرنے لگیں۔ بہو کچھ بھی کرتی تھی اُن کے اپنے قلعے تو محفوظ تھے۔ تو پھر شکایت کیسی؟ پھر کچھ دن کے لئے بہو کے عشق کا چرچا کم ہونے لگا۔ لوگ کچھ بھولنے لگے۔ مگر تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ بہو کا بھاری بھرکم جسم بھی دال کے کالے کو زیادہ دن نہ چھپا سکا۔ اور لوگ شدّ و مد سے بُڑھیا کو سمجھانے لگے۔ مگر اس نئے موضوع پر بُڑھیا بالکل اُڑن گھائیاں بتانے لگی۔ بالکل ایسی بن جاتی جیسے ایک دم اونچا سُننے لگی ہے۔ اب وہ زیادہ تر کھاٹ پر لیٹی بہو اور رتی رام پر حکم چلایا کرتی۔ کبھی کھانستی چھینکتی باہر دھوپ میں آ بیٹھتی تو وہ دونوں اُس کی ایسی دیکھ ریکھ کرتے جیسے وہ کوئی پٹ رانی ہو۔

بھلی بیبیوں نے اُسے بہت سمجھایا۔ رتی رام کا مُنہ کالا کر۔ اور اس سے پہلے کہ رام اوتار لوٹ کر آئے بہو کا علاج کروا ڈال۔ وہ خود اس فن میں ماہر تھی۔ دو دن میں صفائی ہو سکتی ہے۔ مگر بُڑھیا نے کچھ کر ہی نہ دیا۔ بالکل ادھر اُدھر کی شکایتیں کرنے لگی کہ اُس کے گھٹنوں میں پہلے سے زیادہ اینٹھن ہوتی ہے۔ نیز کوٹھیوں میں لوگ بہت ہی زیادہ بادی چیزیں کھانے لگے ہیں۔ کسی نہ کسی کوٹھی میں دست لگے ہی رہتے ہیں۔ اُس کی مثال مثول پر ناصحین جل کر خاک ہو گئے۔ مانا کہ بہو عورت ذات ہے، نادان ہے، بھولی ہے۔ بڑی بڑی شریف زادیوں سے خطا ہو جاتی ہے لیکن اُن کی اعلیٰ خاندان کی معزز ساسیں یوں کان میں تیل ڈال کر نہیں بیٹھ جاتیں۔

پھر نہ جانے بڑھیا کیوں سٹھیا گئی تھی۔ جس بلا کو وہ بڑی آسانی سے کوٹھی کے کوڑے کی تہہ میں دفن کر سکتی تھی، اُسے آنکھیں میچے پلنے دے رہی تھی۔

رام اوتار کے آنے کا انتظار تھا۔ ہر وقت دھمکیاں تو دیتی رہتی تھی۔

"آن دے رام اوتار کا۔ کہاں گی۔ تو ری ہڈی پسلی ایک کر دیتا ہے ——"

اور اب رام اوتار لام سے زندہ واپس آ رہا تھا۔ فضا نے سانس روک لی تھی۔ لوگ ایک مہیب ہنگامے کے منتظر تھے۔

مگر لوگوں کو سخت کوفت ہوئی جب بہو نے لونڈا جنا۔ بجائے اُسے زہر دینے کے بڑھیا کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ رام اوتار کے جانے کے دو سال بعد پوتا ہونے پر قطعی متعجب نہ تھی۔ گھر گھر بیٹھے پرانے کپڑے اور دوائی بیچتی پھری۔ اُس کا بھلا چاہنے والوں نے اُسے حساب لگا کر بہت سمجھایا کہ لونڈا رام اوتار کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر بڑھیا نے قطعی سمجھ کر نہ دیا۔ اُس کا کہنا تھا، اساڑھ میں رام اوتار لام پہ گیا۔ جب بڑھیا پیلی کوٹھی کے نئے انگریزی وضع کے سنڈاس میں گر پڑی تھی۔ اب چیت لگ رہا ہے اور جیٹھ کے مہینے میں بڑھیا کو لُو لگی تھی مگر بال بال بچ گئی تھی۔ جبھی سے اُس کے گھٹنوں کا درد بڑھ گیا۔ "وید جی پورے حرامی ہیں۔ دوا میں کھریا ملا کر دیتے ہیں۔" اس کے بعد وہ بالکل اصل سوال سے ہٹ کر خبطیوں کی طرح اول فول بکنے لگتی۔ کس کے دماغ میں اتنا بوتا تھا کہ وہ بات اس کائیاں بڑھیا کو سمجھاتا جسے نہ سمجھنے کا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

لونڈا پیدا ہوا تو اُس نے رام اوتار کو چٹھی لکھوائی۔

"رام اوتار کو بعد چُمّا پیار کے معلوم ہو کہ یہاں سب کشل ہیں اور تمہاری کشلتا بھگوان سے نیک چاہتے ہیں اور تمہارے گھر میں پوت پیدا ہوا ہے، سو تم اس خط کو تار سمجھو اور جلدی سے آ جاؤ۔"

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اوتار ضرور چراغ پا ہوگا۔ مگر سب کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی جب رام اوتار کا مسرت سے لبریز خط آیا کہ وہ لونڈے کے لئے موزے

اور بنیائن لا رہا ہے۔ جنگ ختم ہو گئی اور اب بس وہ آنے ہی والا تھا۔ بڑھیا پوتے کو گھٹنے پر لٹائے کھاٹ پر بیٹھی راج کیا کرتی۔ بھلا اس سے زیادہ حسین بڑھاپا کیا ہوگا کہ ساری کوٹھیوں کا کام تڑت پھڑت ہو رہا ہو۔ مہاجن کا سود پابندی سے چُک رہا ہو اور گھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔

خیر، لوگوں نے سوچا، رام اوتار آئے گا، اصلیت معلوم ہوگی تب دیکھ لیا جائے گا۔ اور اب رام اوتار جنگ جیت کر آ رہا تھا۔ آخر کو سپاہی ہے، کیوں نہ خون کھولے گا۔ لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ شاگرد پیشے کی فضا جو بہو کی توتا چشمی کی وجہ سے سو گئی تھی، دو چار خون ہونے اور ناکیں کٹنے کی آس میں جاگ اُٹھی۔

لونڈا سال بھر کا ہو گا جب رام اوتار لوٹا۔ شاگرد پیشے میں کھلبلی مچ گئی۔ باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سا پانی جھونک دیا تاکہ اطمینان سے جھگڑے کا لطف اُٹھائے۔ دھوبی نے کلف کا برتن اُتار کر منڈیر پہ رکھ دیا اور بہشتی نے ڈول کنوئیں کے پاس ٹیک دیا۔

رام اوتار کو دیکھتے ہی بڑھیا اُس کی کمر سے لپٹ کر چنگھاڑنے لگی۔ مگر دوسرے لمحے کھیسیں کاڑھے لونڈے کو رام اوتار کی گود میں دے کر ایسے ہنسنے لگی جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو۔

رام اوتار لونڈے کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگا جیسے وہی اُس کا باپ ہو۔ جھٹ پٹ اُس نے صندوق کھول کر سامان نکالنا شروع کیا۔ لوگ سمجھے کھکری یا چاقو نکال رہا ہے۔ مگر جب اُس نے اُس میں سے لال بنیائن اور پیلے موزے نکالے تو سارے عملے کی قوت مردانہ پر ضرب کاری لگی۔ ہت تیری کی! سالا سپاہی بنتا ہے، ہیجڑا زمانے بھر کا۔

اور بہو! سمٹی سمٹائی جیسے نئی نویلی دلہن۔ کانسی کی تھالی میں پانی بھر کر رام اوتار کے بدبودار فوجی بوٹ اُتارے اور چرن دھو کر پئیے۔

لوگوں نے رام اوتار کو سمجھایا۔ پھبتیاں کسیں، اُسے گاؤدی کہا۔ مگر وہ گاؤدی کی طرح کھیسیں کاڑھے ہنستا رہا۔ جیسے اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ [illegible] رام کا گونا ہونے والا تھا، سو وہ چلا گیا۔

qasarulkutub.blogspot.com

رام اوتار کی اس حرکت پر تعجب سے زیادہ لوگوں کو غصہ آیا۔ ہمارے ابا جو کام دھندے پر تین دنوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے وہ بھی چیں بہ جبیں ہو گئے۔ اپنی ساری توہین و ذلت کا بدلہ رام اوتار کو قائل کرنے پر تل گئے۔

"کیوں بے ... سال بعد لوٹا ہے نا؟"

"معلوم نہیں حضور ... اتنا ہی رہا ہوگا۔"

"ادھر لونڈا سال بھر کا ہے۔"

"اتنا ہی لگے ہے سرکار، پر بڑا بدمعاش ہے سسرا" رام اوتار شرمائے۔

"ابے تو حساب لگاوے"

"حساب ... کیا لگاؤں سرکار" رام اوتار نے مری آواز میں کہا۔

"الو کے پٹھے یہ کیسے ہوا؟"

"اب جے میں کا جانوں سرکار ... بھگوان کی دین ہے۔"

"بھگوان کی دین اتیرا سر ... یہ لونڈا تیرا نہیں ہو سکتا۔"

ابا نے اسے چاروں اور سے گھیر کر قائل کرنا چاہا کہ لونڈا حرامی ہے۔ تو وہ کچھ کچھ قائل سا ہو گیا۔ پھر مری ہوئی آواز میں احمقوں کی طرح بولا۔

"تو اب کا کروں سرکار ... حرامجادی کو میں نے بڑی مار دی۔" وہ غصّے سے بپھر کر بولا۔

"ابے نرا الو کا پٹھا ہے تو ... نکال باہر کیوں نہیں کرتا کمبخت کو۔"

"نہیں سرکار، کہیں ایسا ہوئے سکے ہے" رام اوتار گھگھیانے لگا۔

"کیوں بے؟"

"حجور ڈھائی تین سو پھر دوسری سگائی کے لئے کہاں سے لاؤں گا اور برادری جمائے میں سو دو سو الگ خرچ ہو جائیں گے۔"

"کیوں بے، تجھے برادری کیوں کھلانی پڑے گی؟ بہو کی بدمعاشی کا تاوان تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا؟"

"جے میں نہ جانوں سرکار، ہمارے یہاں ایسا ہی ہووے ہے۔"

"مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار ... اس حرامی رتی رام کا ہے۔" ابا نے عاجز آ کر سمجھایا۔

"تو کا ہوا سرکار ... میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام۔ کوئی گیر نہیں، اپنا ہی کھون ہے۔"

"نرا الو کا پٹھا ہے۔" ابا بھنا اٹھے۔

"سرکار، لونڈا بڑا ہو جاوے گا، اپنا کام سمیٹے گا۔" رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا۔

"وہ دو ہاتھ لگائے گا، سو اپنا بڑھاپا پار ہو جائے گا۔" ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں، ایک دم رام اوتار کے ساتھ ساتھ ابا کا سر بھی جھک گیا۔ جیسے اُن کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے ... یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی۔ یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں جو دُنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں اُس کے بڑھاپے کا بوجھ اُٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے منّے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

qasarulkutub.blogspot.com

یار

جب اکبر نے فریدہ کو ریاض سے ملایا تو اُن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ریاض معصوم صورت خوش سا لڑکا تھا۔

"ہم دونوں ایک ہی گلی میں پلے۔ گلی اور کبڈی کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ اتفاق سے کالج میں بھی ساتھ نہ چھوٹا۔ پھر یہ بھی بمبئی آ گیا۔ کتنا عجیب اتفاق ہے۔" اکبر نے کہا تھا۔ "ذرا بورنگ سا انسان ہے" یہ جملہ بھی ساتھ لگا دیا تھا۔

شروع شروع میں عموماً تینوں ساتھ ساتھ رہتے۔ سینما کے تین ٹکٹ خریدے جاتے۔ ہوٹل میں تین سیٹیں ریزرو ہوتیں۔ ریاض کا وجود کچھ لازم و ملزوم جیسا ہو گیا تھا۔ پھر جوں جوں شادی پرانی ہوتی گئی اور اکبر کی مصروفیتیں بڑھتی گئیں فریدہ اور ریاض کا ساتھ بھی بڑھتا گیا۔ اکبر تو نئے دوستوں اور نئے مشغلوں میں ڈوب کر دیر سے آتے۔ ریاض سیدھا دفتر سے آ جاتا۔ چائے پی کر اخبار یا میگزین دیکھا کرتا۔ کبھی دونوں کیرم یا تاش کھیلنے لگتے۔ کبھی کسی سہیلی سے ملنے جاتی اور اکبر کو دیر ہو جاتی تو وہ ریاض کو لے جاتی۔ اکبر تو کبھی عورتوں کی غیر دلچسپ باتوں سے گھبرا کر چل بھی دیتا۔ "تم ریاض کے ساتھ لوٹ آنا۔"

اور وہ ریاض کے ساتھ لوٹ آتی۔

شادی پرانی ہوتی گئی مگر ریاض کی اہمیت دن بدن بڑھتی گئی۔ فریدہ نے انجانے طور پر سارے شوہروں والے اوپری کام ریاض سے لینے شروع کر دئیے — نوکروں کی مرمت کرنا، راشن کارڈ بنوانا، شاپنگ کے لئے ساتھ ساتھ دھکے کھاتے پھرنا، چھوٹے موٹے خط لکھنا، بینک میں روپیہ جمع کرانا، نکلوانا۔ اور مختلف کام کرنا۔

یہاں تک کہ جب فریدہ کا "مس کیریج" ہوا تو خوش قسمتی سے ریاض دفتر میں مل گیا۔ اسی نے آ کر ہسپتال پہنچایا۔ اس دن اکبر کے کسی افسر کی الوداعی پارٹی تھی۔ جب وہ وہاں سے رات کو دو بجے گھر پہنچے اور بیگم کی بدحالی کا پتہ چلا تو ظاہر ہے بہت گھبرائے۔ مگر صبح کا انتظار کرنا پڑا۔ افسر کو سٹیشن پر رخصت کر کے جب وہ ہسپتال پہنچے تو اُجاڑ صورت ریاض کو دیکھ کر اُن کا بھی رنگ اُڑ گیا۔ وہ ساری رات بنچ پر بیٹھا اونگھتا رہا تھا۔ اکبر نے اُسے زبردستی آرام کرنے کے لئے بھیجا۔

اُنہیں ہسپتال روز جانے کی فرصت نہ تھی۔ اس لئے وہ ریاض ہی کو فون کر کے دوائیں وغیرہ خریدنے کی ہدایت دے دیتے۔ حسنِ اتفاق کہئے یا قسمت جب وہ اچھی ہو گئی۔ اور وہ اُسے ہسپتال سے گھر لانے موٹر لے کر گئے تو معلوم ہوا کہ وہ صبح ہی ریاض کے ساتھ گھر آ چکی تھی۔ ریاض نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔ دن بھر کے بعد جب اکبر دفتر سے لوٹے تو ریاض گھر سنبھالے ہوئے تھا۔

پھر دن گزرتے گئے۔ اکبر کی بے توجہی اور غیر دلچسپی نے اور بھی ذمہ داریاں ریاض کے کاندھوں پر ڈال دیں۔ وہ ابھی تک چھڑا تھا۔ دو ایک جگہ لوگوں نے شادی کرانے کی کوشش کی۔ مگر وہ ٹالتا رہا۔ "بھئی مجھے خانہ داری کے جھگڑوں سے وحشت ہوتی ہے۔" وہ کہہ کر ٹال دیتا۔ اور بات بھی خدا لگتی تھی۔ اکبر تو اُسے ہمیشہ یہی نصیحت کرتے۔ "میاں اس چکر میں نہ پھنسنا، کسی کام کے نہیں رہو گے۔ اپنی جو گت ہے وہ دیکھ ہی رہے ہو۔ شادی وبال ہے۔"

پھر بال بچے ہوئے۔ اکبر تو بچوں کی چل پوں سے گھبرا کر کلب چلے جاتے یا کسی یار دوست کے یہاں پینے پلانے کا پروگرام رہتا۔ ریاض دفتر سے سیدھے اُن کے

گھس جاتے، بچوں سے کھیلا کرتے، روتے بچوں کو شہد چٹا دیا۔ گرائپ واٹر دے دیا۔ فریدہ کو الٹے سیدھے کام لینے میں بہت مزہ آتا۔ وہ بے تکے پنے سے بچے کا نیپکن بدلتا، بات میں پانی ڈالتا تو وہ ہنستے ہنستے لوٹ جاتی۔ پہلے تو اسے بڑی گھبراہٹ ہوتی۔ سر سے پیر تک بھیگ جاتا۔ لیکن فریدہ منع کرتی تو کہتا — "کوئی بات نہیں۔"

"اچھا ہے تم یہ کام سیکھ لو تمہاری بیوی مزے کرے گی۔" وہ ہنستی اور ریاض بھی ہنس دیتا۔ کبھی کوئی بچہ بے بات رونے لگتا، فریدہ کسی دوسرے کام میں مشغول ہوتی تو وہ ریاض کو ڈانٹتی۔ "اے ہے کیسے بے ہودہ آدمی ہو، بچہ رو رہا ہے۔ ذرا چپ کرا دو نا۔"

"الو کی اولاد چپ ہی نہیں ہوتا۔"

"تو ٹوٹے ہاتھوں سے اٹھایا نہیں جاتا؟"

اور وہ بچے کو اٹھا کر اسے بہلانے کیلئے عجیب بندروں کی سی حرکتیں کرتا۔ بچہ بہل جاتا۔

جوں جوں بچے بڑھے۔ ریاض کی ذمہ داریاں بھی بڑھیں۔ بچوں کا کس اسکول میں داخلہ کرایا جائے، یونیفارم ریاض کے ایک دوست کے ذریعہ سستا مل سکتا ہے۔ شکر بلیک سے لینی ہو تو فریدہ اور فریدہ کی ساری سہیلیوں کے لئے ریاض مہیا کرے۔ خود اکبر ان کاموں سے جی چراتے تھے۔ کبھی کوئی ایسا فلم آتا جس سے اکبر کو دلچسپی نہ ہوتی تو وہ خود کہہ دیتے "بھئی تم ریاض کے ساتھ دیکھ آؤ مجھے ایسے فلموں سے دلچسپی نہیں۔"

اکبر کی دلچسپیاں بہت کچھ پینے پلانے کے گرد محدود ہوتی جا رہی تھیں۔

ظاہر ہے اس صورت میں ریاض رات کا کھانا بھی یہیں کھانے لگا۔ فریدہ اُن کے ساتھ بچوں کو سیر کراتی، سرکس دکھاتی۔ شام کو دونوں مل کر بچوں کے ساتھ کھیلتے، پھر بہلا پھسلا کر کپڑے بدلا کر سلا دیتے۔ اکبر کو ان جھگڑوں کے لئے فرصت نہ تھی۔ بچے بھی باپ سے بے تکلف نہ تھے۔ ریاض کے کندھوں پر چڑھ کر "انکل انکل" کر کے پیسے مانگتے۔ نئی نئی فرمائشیں کرتے۔ اکبر تو فریدہ کو گھر کا خرچ دے دیتے تھے، انہیں تحفے دینے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بچے بھی جان گئے تھے۔

آندھی آئے، پانی برسے، ریاض کا آنا ناغہ نہ ہوتا۔ اگر کسی وجہ سے وہ کسی دن نہ آپاتے تو سارا گھر پریشان ہو جاتا۔ فریدہ جھنجھلائی ہوئی پھرتیں۔ سارے پروگرام الٹ جاتے۔ خدا جانے ریاض کو کیا ہو گیا۔ بیمار تو نہیں پڑ گئے؟ کوئی ایکسیڈنٹ تو نہیں ہو گیا؟ کبھی نوکر دوڑاتیں، کبھی پڑوس میں ٹیلی فون کرتیں۔ اگر بدقسمتی سے ریاض کسی دوست کے ساتھ سینما دیکھنے چلا گیا ہوتا تو دوسرے دن اُن کی شامت آجاتی۔

"کہاں مر گیا تھا ذلیل، مجھے فون ہی کر دیا ہوتا تو میں اتنی پریشان نہ ہوتی۔ فلم کے ٹکٹ منگائے تھے بڑی مشکل سے واپس ہوئے، نہ ہوتے تو تمہیں پیسے بھرنا ہوتے۔"

بچے بھی پیچھے پڑ جاتے "ہم آپ سے نہیں بولتے۔ آپ کل آئے کیوں نہیں؟"

جرمانے وصول کر کے ملاپ ہوتا اور وہ نہایت پابندی سے آنے لگتے۔

اگر کبھی ریاض کی طبیعت خراب ہو جاتی تو فریدہ بچوں کو لے کر اُن کے گھر دھاوا بول دیتیں۔ تیمارداری کم، خود اپنی خاطر زیادہ کرواتیں۔ ان جھگڑوں سے جان چھڑانے کے لئے ریاض بیمار ہوتے ہی اُن کے گھر آن پڑتے۔

اور پھر ایسا ہی ہونے لگا کہ اگر کسی دن غلطی سے اکبر دفتر سے سیدھے گھر آجاتے تو بچے اور بیوی گھبرا جاتے کہ ان پر یہ کیا مصیبت ٹوٹ پڑی جو یوں آنا پڑا۔ فریدہ اور ریاض کا پروگرام لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ سینما کے دو ٹکٹ ہوتے تو پھر تیسرا کہیں الگ ملتا اور نکلتا ریاض کو الگ بیٹھنا پڑتا۔ مارے شرمندگی کے مزہ کرکرا ہو جاتا کہ روز تو اس کو وہ جہاں چاہے گھسیٹ لے جاتی ہے ایک دن شوہر نامدار پھاند پڑیں تو اُس غریب کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا جائے۔

کھانے پر بھی گڑبڑ ہو جاتی۔ عموماً اکبر کے لئے میز پر پلیٹ لگائی ہی نہیں جاتی تھی۔ رات کو دو ڈھائی بجے پی کر آتے تو اپنے کمرے ہی میں کھانے کی ٹرے منگوا لیا کرتے تھے۔ جس دن وہ جلدی آجاتے تو ایسا معلوم ہوتا، کوئی مہمان بے وقت ٹپک پڑا ہو۔ جلدی جلدی اُن کے لئے جگہ بنائی جاتی۔ ریاض جو عموماً فریدہ کے قریب ہی بیٹھتا تھا تاکہ بچوں کو کھانا دینے میں مدد دی جائے، آخری کرسی پر دور جا بیٹھتا۔ بچے حیرت سے اُسے دیکھتے۔ فریدہ کو بڑی کوفت ہوتی۔ کیوں کہ اکبر بالکل اجنبیوں کی طرح تھے۔

qasarulkutub.blogspot.com

فریدہ کو اکیلے ہی بچوں کو سنبھالنا پڑتا۔ اگر اکبر کچھ مدد کرنے کی کوشش بھی کرتے تو بدمزگی پیدا ہو جاتی۔

"ارے ارے یہ اتنے چاول اس کی پلیٹ میں بھر دیے، مار دو گے کمبخت کو؟ یوں بھی اسے کھانسی ہے۔ وہی نہ دو۔ ارے یہ چٹنی تو بچوں کی ننھی منی نے ختم کر دی۔" اور اکبر قرم سے رہ جاتے۔

"ریاض بیٹھے بیٹھے خود ٹھونس رہے ہو اتنا نہیں ہوتا کہ بچوں کو بھی دے دو۔ میرے دو ہاتھ ہیں۔ کیا کیا کروں؟" وہ ڈانٹتی۔ اور ذرا سی دیر میں ریاض پوری میز کا چارج لے لیتا۔ نہایت حساب کتاب سے وہ کھانا تقسیم کر دیتا۔ کسے کون سی بوٹی پسند ہے۔ آج کس کی گودے کی ہڈی کی باری ہے۔ گردہ کسے ملے گا۔ کسے دانتہ ملے گا، کسے سوپ۔ پھر کسی کو ڈراتا ہے۔ کسی کو بہلاتا ہے۔ کون ذرا سی ڈانٹ ڈپٹ دے دی۔ تو ساری میز لوٹ پوٹ کر ڈالے گا۔ کون ڈانٹ کے بغیر بھوکا لیور تار ہو جائے گا۔

پھر وہ لطیفے اور چٹکلے۔ روڈی کی کہانی ــــ بوڑی کا قصہ ــــ مرچوں کے چٹپٹے واقعے ــــ اکبر کو کیا معلوم؟ وہ تو ریاض کو ہی ازبر تھے۔ وہ اُن کے نجی مذاق جو باہر والے کی سمجھ میں نہیں آ سکتے تھے ــــ اور اکبر یہ سب ہرداتے تھے۔ لومڑی کی دعوت میں سارس کی طرح حونق اور اُکتائے ہوئے کھانا زہر مار کرتے رہتے۔

اکبر دہلی نہیں جا سکتے تھے۔ چھٹیاں تو تھیں، مگر ان دنوں کرکٹ میچ ہو رہے تھے۔ اور وہ میچ کے دیوانے تھے۔ کبھی ریاض بھی ان میچوں کا دیوانہ تھا۔ مگر چوں کہ فریدہ کو ان سے وحشت ہوتی تھی۔ اُس نے کہہ کہہ کر دلچسپی چھڑا دی۔ میچ آتے تو اُسے ایسا معلوم ہوتا اُس کی جان پر سوتن آ گئی۔ اس لئے اُس نے عجیب و غریب چالیں چل کر ریاض سے یہ میچ چھڑائے۔ وہ ان دنوں پکنکوں کے پروگرام بنا لیتی۔ سینما کے ٹکٹ خرید لیتی، ہر وقت میچ کی بُرائیاں کرتی۔ ڈینٹسٹ سے وقت مقرر کر لیتی۔ بغیر محسوس کئے ریاض کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ ہاں سوئمنگ کا شوق قائم رہا۔ حالانکہ فریدہ کو پانی سے ڈر لگتا تھا، مگر وہ بچوں کے ساتھ جاتی۔ ریاض بچوں کو تیرنا سکھایا کرتا اور وہ کنارے بیٹھی سوئٹر بُنا کرتی۔

شروع شروع میں اُس نے اکبر کے لئے سوئٹر بُنے، مگر اُنہوں نے وہ سوئٹر خاص طور پر ان دوستوں کو دے دئے جو فریدہ کو زہر لگتے تھے۔ ریاض کے پاس بیس بیس برس کی پُرانی چیزیں سنبھتی رکھی تھیں۔ ہر سال وہ ایک نئے سوئٹر کے ساتھ پُرانے سوئٹر کی بھی مرمت کر دیتی۔

اس کے باوجود اکبر اور فریدہ میاں بیوی تھے۔ اُن کے بچے پیدا ہو رہے تھے۔ وہ ایک ہی گھر میں، ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ اُن کے پلنگوں کے درمیان صرف ڈھائی فٹ کا فاصلہ تھا۔ ظاہر ہے بچوں کو لے کر فریدہ کے اکیلے دہلی جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا ــــ مجبوراً ریاض کا بھی ٹکٹ خریدا گیا۔

فریدہ اپنے بھائی کے گھر میں ٹھہری۔ بھائی بھابی میرٹھ کسی دوست کی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ اپنے دونوں بچوں کو چھوڑ گئے تھے۔ دہلی میں خوب مزے کئے۔ خوب سیریں کیں۔ پچھلی مرتبہ اکبر کے ساتھ آنا ہوا تھا۔ اُنھیں باہر جانے سے بڑی گھبراہٹ ہوتی تھی۔ ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ سرِ شام ہی سے لوگ "شغل" کے لئے جمع ہو جاتے۔ بڑی چہل پہل رہتی ــــ مگر بچے ساتھ نہیں تھے۔ وہ اُنہیں ریاض کے پاس چھوڑ گئی تھی۔ بالکل نئے سرے سے ہنی مون کا لُطف آ گیا تھا۔ مگر کبھی بچوں کی یاد آ کر مزہ کرکرا کر دیتی ــــ بچوں کو جو ریاض کی نگرانی میں چھوڑ گئی تھی۔ مگر اب کی دفعہ بچے ساتھ تھے۔ اکبر کی غیر حاضری اُس نے بار ہا محسوس کی ــــ مگر اب تو کچھ عادت سی پڑ چکی تھی۔

ریاض نے خوب سیریں کرائیں۔ تصویریں کھینچیں، فریدہ کی، اور بچوں کی ہنستی ہوئی، کھلکھلاتی ہوئی۔ کبھی فریدہ کہتی "ریاض تم بھی تو آؤ ــ کسی سے کہو بٹن دبا دے" اور ریاض بھی فریدہ کے قریب آ جاتا ــــ آس پاس بچے ہوتے۔

بھائی کے بچے منّو اور شہنہ جو پہلی مرتبہ فریدہ کے بچوں سے ملے تھے۔ ریاض کو انکل کہتے اور بڑے گھُل مل گئے۔ مگر ایک دن شہنہ نے بڑے تعجب سے پوچھا "تم اپنے ڈیڈی کو انکل کیوں کہتے ہو؟"

"کیسے؟"

qasatulkutub.blogspot.com

"انکل ریاض کو ——"

"سنی —— انکل ریاض ہمارے انکل ہیں نا"

"اچھا یہ تمہارے ڈیڈی نہیں ——؟" شہنہ نے معصومیت سے پوچھا۔

اور بچوں نے خوب اس کا مذاق اُڑایا۔ "انکل یہ آپ کو ہمارا ڈیڈی سمجھتی ہیں۔ اُتو کہیں کی"

ریاض کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا۔ فریدہ کو بھی ہنسی آگئی۔

"تو کیا تو میری بیٹی نہیں؟ ——" ریاض نے کہا۔

"مگر ——" بچی کی سمجھ میں نہ آیا اپنا مطلب کیسے واضح کرے۔

"جا بھنگن تو میری بیٹی نہیں —— اب مانگنا چاکو لیسٹ"

"اوں —— بیٹی ہوں آپ کی ——" بچی اُس کے گلے سے جھول گئی۔

فریدہ کی سہیلی نے دعوت کی۔ بچوں کا کیا کیا جائے۔

"کل الا بلا کھانے سے گلے میں درد ہو رہا ہے —— تم چلی جاؤ میں بچوں کو دیکھ لوں گا ——" ریاض نے سر کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ فریدہ خوشی خوشی تیار ہوئی۔ مگر جانے سے پہلے اُسے غرارے کیلئے پانی دیا۔ ہنسین کی گولیاں چوسنے کی ہدایت کی۔ بچوں کے بارے میں احکامات جاری کئے اور بن سنور کر جانے لگی۔

"اُفوہ —— تمہاری اس برقان زدہ ساڑھی سے بڑی وحشت ہوتی ہے۔ قسم خدا کی ایک دن اسے جلا دوں گا" ریاض نے پلنگ پر لیٹے لیٹے پکارا۔

"اوہو آپ کون ہوتے ——" اُس نے ٹالنا چاہا۔ مگر قدِ آدم آئینہ میں دیکھا تو ایسا لگا ریاض ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ساڑھی بدل ڈالی۔

پارٹی شاندار رہی۔ سب نے اُس کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔ یہ بتاتے ہوئے اُسے کچھ ہتک محسوس ہوئی کہ وہ میچ کی وجہ سے نہیں آئے۔ کسی کو کچھ بتایا، کسی کو کچھ۔ بات ٹال دی۔

"بچوں کو ریاض پر چھوڑ آئی ہوں، پریشان کر رہے ہوں گے" سہیلی نے

روکا تو فریدہ نے کہا۔

"بھئی آپ خوب ہیں —— میاں سے بچے پلواتی ہیں" سہیلی کے میاں نے شکایت کی۔

"مگر میرے میاں تو بمبئی میں ہیں"

"آپ تو کہہ رہی تھیں کہ بچے ریاض پہ چھوڑ آئی ہوں"

"اے ہے ڈارلنگ —— ہاؤ سلی۔ فری کے ہسبنڈ کا نام تو اکبر ہے" سہیلی نے بات صاف کی۔

"اوہ —— اور ریاض ——؟"

"اکبر کے بچپن کے دوست بلکہ بھائی ہی سمجھئے"

"بلکہ اکبر ہی سمجھ لیجئے تو کیا حرج ہے؟" زوردار قہقہہ پڑا۔

فریدہ کو ذرا کوفت ہوئی۔ کتنے چیپ ہیں یہ لوگ —— اُف لعنت! انہیں کون سمجھائے۔ کئی بار لوگوں نے غلطی سے ریاض کو اس کا شوہر سمجھ لیا۔ اُسے بُرا نہ لگا ضرور وہ لوگ نہایت احمق سے لگے۔ اُف، کیا ہوتا ہے ان باتوں سے، کیا بگڑتا ہے۔ مگر بات زیادہ سنورتی نہ معلوم ہوئی تو اُس کی سہیلی نے کہا "ریاض کی شادی زینت سے کیوں نہیں کروا دیتیں؟"

"ارے بہن کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کمبخت سے۔ سنتا ہی نہیں، مذاق میں ٹال دیتا ہے"

"تم کہو تو وہ فوراً مانے گا ——"

"تو تمہارا مطلب ہے میں نے اُس سے نہیں کہا؟" فریدہ جلی۔

"نہیں ذرا زور ڈالو نا"

"میں کیسے زور ڈالوں —— کوئی بچہ ہے کہ پچھاڑ کر دوا پلا دوں" وہ اور بگڑ گئی۔

"اے ہے، اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے"

"میں تو خاک نہیں بگڑتی ——" فریدہ نے بہت ہی بگڑ کر کہا۔

"اچھا جانے دو" سہیلی اپنی جان چھڑا کر بھاگی۔ فریدہ کھسیانی رہ گئی۔ لوگ

qasarulkutub.blogspot.com

سمجھتے ہیں وہ ریاض کی شادی نہیں ہونے دیتی۔ اُسے ریاض پر غصہ آنے لگا۔ اُس نے کتنی بار کہا کہ کمبخت شادی کیوں نہیں کرتا۔ ہمیشہ ٹال دیتا ہے۔

"ارے بھابی ——"

"کیا جاہلوں کی سی باتیں کرتی ہو۔"

"بھئی میں جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا۔" اور وہ بچوں کے ساتھ ادھم مچانے لگتا یا ڈانٹ کر اُن کو ہوم ورک کروانے لگتا۔ اُن کی رپورٹ پر غور کرنا — اُستادوں سے ملنا یہ بے چارے اکبر کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ بے دیکھے دستخط کر دیتے اور کہہ دیتے۔

"ریاض سے کہو اچھی طرح دیکھ لے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

ایک دن ریاض بڑے غصے میں باہر سے آیا اور فریدہ کو ڈانٹنا شروع کیا۔ "کچھ ہوش بھی ہے صاحب زادی ابھی سے پیر نکال رہی ہیں —— نہ جانے کن لونڈوں کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ میرا تو قسم خدا کی خون کھول گیا۔"

"میرا تو کہنا ہی نہیں مانتی ——" فریدہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

"نہیں مانتی تو ٹھوکو چڑیل کو۔ نہیں تو میں ٹھوکوں گا۔"

"مار پیٹ سے کیا ہو گا ——؟" پھر دونوں گھنٹوں بچوں کی نفسیات کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتے رہے۔ دونوں میں سے کسی کو خیال بھی نہ آیا کہ اس معاملہ میں اکبر کی رائے بھی لی جائے۔ کیا فائدہ بے کار پریشان ہو جائیں گے۔ اُن کی شراب نوشی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ذرا سی بات پر بہت ہی پریشان ہو جاتے تھے اور پھر سب کی زندگی حرام ہونے لگتی تھی۔

دہلی کی سیر ہو چکی تھی۔ بچوں کی چھٹیاں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ فریدہ کو بھائی بھاوج کا انتظار تھا کہ آ جائیں تو اُن سے مل کر جائے۔

"اکبر نہیں آئے ——؟" اُنھوں نے آتے ہی حیرت سے پوچھا۔

"اُنھیں کچھ کام تھا ——" فریدہ صاف جھوٹ بول گئی۔

"اور یہ باہر کمرے میں کون ٹھہرا ہوا ہے؟"

"ریاض۔" فریدہ نے لاپروائی سے کہا۔ مگر اُسے ڈر لگنے لگا۔

"ریاض —— یعنی وہ تمہارے ساتھ یہاں بھی آیا ہے؟"

"ہاں —— مگر ——" فریدہ اُن کے لہجہ سے چونکی۔

"میں ان حرکتوں کو قطعی پسند نہیں کرتا" —— وہ غرّائے۔

"اے ہے جانے بھی دیجیے۔" بھابی نے سمجھایا۔ "باہر آواز جائے گی۔"

"آواز جائے گی تو جانے دو۔ میں کسی حلال زادے سے ڈرتا ہوں؟ شرم نہیں آتی —— اب تو بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ تمہارے یہ گُن دیکھ کر وہ کیا سیکھے گی۔ تم اکبر کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ مگر مجھے اُلّو نہیں بنا سکتیں —— دُنیا تمہارے جہنم میں تھوک رہی ہے۔"

"جہنم میں تھوک رہی ہے؟" فریدہ نے سوچا۔

"اکبر جیسا بے شرم انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیا اُسے کچھ نظر نہیں آتا؟"

"کیا نظر نہیں آتا ——؟" فریدہ نے اور سوچا۔

"مگر تمہاری یہ ہمت کہ تم میرے گھر میں غلاظت پھیلا رہی ہو ——"

"غلاظت . . .؟" سوچتے سوچتے فریدہ کی کنپٹیاں جھنا گئیں۔

"اپنے یار کو ساتھ لئے پھرتی ہو۔" بھابی نے بہت روکا۔ مگر وہ کہہ ہی گئے۔

"یار؟" فریدہ کا جی چاہا زور کا قہقہہ لگائے۔ ریاض اُس کا یار ہے۔ مگر ہنسی اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ بیس برس زن زن کرتے نظروں میں گھوم گئے —— یار؟ دُنیا کی نظروں میں ریاض اُس کا یار نہیں تھا، تو پھر کون تھا . . .؟ اور وہ چپ چاپ اُٹھ کر سامان باندھنے لگی۔

qasarulkutub.blogspot.com

بے کار

اسّی روپے تنخواہ، مہنگائی بھتہ، امتحانوں کی فیس ملا جُلا کر گذر ہو جاتی تھی۔ کچھ بچتا ہی نہ تھا، مگر قرض ایک مہینے کا دوسرے مہینے میں چلتا ہی چلا جاتا تھا۔ نسیم کی پیدائش میں بھی کھینچ تان کر پورا پڑ جاتا۔ اگر ناجرہ کا بخار جان کو نہ لگ گیا ہوتا تو جھمکیوں کو بیچنے کی نوبت نہ آتی۔ کس ارمان سے جھمکیاں بنوائی تھیں! بڑا دکھ ہوا۔ خیر پھر بن جائیں گی۔

مگر یہ سب دل کے بہلاوے کی باتیں ہیں۔ جہیز کی ساری چیزیں جب ایک بار ختم ہو کر پھر نہ بن سکیں۔ جگنو مہدی کے امتحان کی فیس کی نذر ہو گیا۔ سوچا تھا، چلو نوکری تو مستقل ہو جائے گی ہزار جگنو بن جائیں گے۔ ہر مہینے جگنو کا حساب لگتا۔ سونے کی قیمت گھٹنے کا نام ہی نہ لیتی۔ غضب خدا کا۔ اکیس روپے سے ایک سو سولہ پر آ گیا۔ بھلا کیا جگنو بنوائے کوئی۔

اللہ میاں نے ماں کی چھاتیوں میں دودھ بھی شاید باقر میاں جیسوں کی تنخواہ کا اندازہ لگا کے دیا ہے۔ مکان کا کرایہ نہ ہو نہ سہی، روکھی سوکھی چل ہی جائے گی پر نہ بچے کا رتی شاندار سامان قدرت نے اپنے ہاتھوں سے سجا دیا ہے۔ مگر بخار میں کمبخت

دودھ بھی سوکھ گیا۔ اماں جی تو یہی کہتی رہیں "بُوا فیشن ہے بوتل سے دودھ پلانے کا۔ ہمارے زمانے میں تین تین سال پلاؤ تب بھی نہیں ختم ہوتا تھا"

پر بھلا اُن سے یہ کون کہتا کہ "بُوا تمھارے زمانے میں ڈالڈا نہیں تھا۔ پھر بھر بھر پیالے اچھوانی سٹوروں سے اُڑاتی تھیں۔ پھر تین سال دودھ پلاتی تھیں تو کون سی توپ چھوڑتی تھیں"۔ مگر بُوا کے مُنہ لگنا اپنی میت اُٹھوانا ہے۔ وہ نیچے جھاڑ کے پیچھے پڑتیں کہ ہوش اُڑ جاتے۔ کئی کئی دن بُوا کے طعنے چلا کرتے۔ جو بات ختم ہوئی، کہہ لیا، سُن لیا، چھُٹی ہوئی۔ مگر بُوا کو اور کام ہی کیا تھا سوائے اپنی گٹھیا کو کوسنے کے۔ گٹھیا کے ساتھ کوئی اور ہاتھ آ جاتا، بس اُسی کو دوہراتیں۔

جب تخفیف میں باقر میاں کا نام آیا تو پہلے تو اسے مذاق سمجھتے رہے۔ نو برس نوکری کی، مستقل نہیں تھے تو کیا ہوا، ہو جائیں گے۔ اپنی سرکار ہے۔ اپنی فکر آپ کرے گی۔ خیر، نوٹس ملا ہے تو کیا ہوا۔ پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا۔ ذرا سی دوڑ دھوپ کے بعد پھر کسی دوسرے اسکول میں لگا دیئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ چھ مہینے کہیں جگہ خالی نہ تھی تو رجسٹرار کے دفتر ہی میں لگ گئے رہے تھے۔ مطلب تو تنخواہ سے تھا۔ جب تک ملتی رہی خیال بھی نہ آیا کہ عارضی ہیں یا مستقل۔

اب کے تو ایسا پکّا جواب ملا کہ ڈیڑھ سال کی دوڑ دھوپ کے بعد معلوم ہوا کہ کسی کے بس کی بات نہیں اور کوئی گنجائش بحالی کی نہیں رہ گئی ہے۔ نو سال مستقل نہ ہونا ہی بُرے دن کا ثبوت تھا۔ ویسے تو ان سے چار ہاتھ اگلے بڑے روٹیاں توڑتے تھے، مگر فرق اتنا تھا کہ انھوں نے مستقلی کی کھائی پھاند لی تھی، انھوں نے سستی یا لاپرواہی کی وجہ سے اس کی کچھ اہمیت ہی نہ سمجھی۔

یہ ڈیڑھ سال کیسے گزرا، یہ ناجرہ بی جانیں یا باقر میاں یا کچھ اماں جی۔ مگر انھیں تو گیارہ روپیہ وظیفہ ملتا تھا۔ اُن کے پان تمباکو اور افیون کو پورا ہو جاتا تھا۔ کبھی کھانے کے سوا اُوپر سے پیسے کے لئے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ پڑی۔ مرنے والے نے مر کے بھی اتنا سہارا تو چھوڑا۔

qasarulkutub.blogspot.com

کیسی جھڑکیاں اور کیسا گلوبند۔ ایک ایک کر کے تار تار پہلے گروی ہوا۔ پھر بک گیا۔ افسروں کے گھر کی خاک سے ڈالی پر نوکری واپس نہ ملی۔ سال میں چھ مہینے دو ایک ٹیوشنیں مل جاتے مگر پھر کلاس پڑھانے کے عادی ٹیوٹروں لوں ایک دو بچوں کو پڑھاتے بوکھلا اُٹھتے۔

ہاجرہ بی نے پنجاب سے میٹرک کر کے اپنے طبقے کی بیویوں میں کافی قابل اعتراض حد تک آزاد ہونے کا رتبہ پا لیا تھا۔ جب شادی ہوئی تو سارا پڑھا لکھا بال بچوں کی دیکھ بھال میں ناک کے راستے نکل گیا۔ برسوں سے کوئی کتاب ہاتھ سے بھی نہیں چھوئی تھی۔ کبھی جی گھبراتا تو دوپہر کو پرانی "سہیلی" کی جلدیں جو میکے سے ملی تھیں پھر پڑھ ڈالتیں۔ ہاجرہ بی کے ابا کو بیٹی کی تعلیم کا بڑا شوق تھا۔ زنانے پرچے مستقل اُس کے نام آتے رہے۔ شادی کے بعد کچھ لاپروائی، کچھ مشغولیت اور کچھ پیسے کی کمی کی وجہ سے رسالے وسالے سب بند ہوگئے۔

جب پڑوسن نے ہاجرہ بی کو پاس کے اسکول میں نوکری کرنے کی رائے دی تو بی اماں نے اُن کی سات پشتوں کی قبر میں کیڑے ڈال دئے۔ پڑھی لکھی عورتوں کے چال چلن کے بارے میں ایسے ڈراونے قصے سنائے کہ ہاجرہ نے کان پکڑ لئے کہ "توبہ میری میں کہاں کرتی ہوں نوکری۔ یہ ساری موئی استانیاں ماسٹروں سے لگی ہوتی ہیں۔ اسکولوں کا تو بہانہ ہے۔ گھر میں ٹکوا نہیں لگتا تو اسکول میں گل کھلاتے جاویں ہیں۔" وہ کہا کرتیں۔

مگر ضرورت انسان کو تھوک کر چاٹنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب گھر سے نکالے جانے کی نوبت آگئی اور پاس پڑوس کے اُدھار دینے والوں نے بیچ بیچ دروازے منہ پر مار دئے تو ہاجرہ کو پڑوسن کی بات پر غور کرنا ہی پڑا۔

"وہ اور کوئی اُلو کے پٹھے ہوں گے جو بیوی کی کمائی کھاتے ہوں گے۔" پوچھنے پر باقر میاں نے کہا، "ابھی اتنا دم ہے۔ جب مر جاؤں تو جو جی میں آئے کر لینا۔"

"اب تو زیور بھی نہیں رہا۔ سب تار تار کر کے بک گیا۔"

"بک گیا تو کیا ہے۔ کہا تو کہ پیسہ آیا تو تمہارا سارا زیور بنوا دوں گا۔ مری کیوں جاتی ہو۔"

"اونہہ، آچکا اب تو پیسہ۔ سال میں تین چار سو میں کیسے گزر ہو سکتی ہے۔"

"دیکھو جی اگر یہ آوارگی کرنا ہے تو طلاق لے لو اور منہ کرو۔ میں دنیا کی لعنتیں نہیں سنوں گا۔" باقر میاں نے غرا کر کہا۔ اور پھر ہاجرہ بی کو ہمت نہ ہوئی۔

ایک تو روپے کی کمی، اوپر سے سب ہی کا مزاج چڑچڑا۔ اماں جی کی تو سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔

"اے بی، ہماری تو اپنے گیارہ روپے میں گزر ہو جاوئے ہے۔ ہم پوچھیں ہیں، دُلہن سے کیوں نہیں گھر چلتا۔" وہ بڑبڑائیں۔ حساب سننے اور سمجھنے کی نہ اُن میں طاقت تھی اور نہ دماغ۔ کوڑی کوڑی کا حساب موجود ہے۔ مگر یہی رٹ لگی ہے۔

"ارے بوا، اتنے روپے میں تو کیسے چل جاویں ہیں۔ تمہارے میں برکت ہی نہیں دلہن۔ آخر ہم کیسے گزر کریں ہیں۔"

"آپ کو نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے۔ نہ کھانے کا۔ نہ بھنگی بہشتی کا۔ رہ گئی افیون کی لت تو......"

لت کا نام سن کر مختصر غفل والی اماں جی کا پٹھانی خون تاؤ کھا گیا۔

"ہمارا رہنا بھی کھٹکے ہے۔ ہاں کرایہ تو اس چوہے کے بل کا۔ دو روٹیاں کھاتی ہوں۔ حساب لگا کے لے لو اپنے پیسے۔ کیا سمجھا ہے؟ ابھی دم ہے اتنا۔ کسی کے برتن بھانڈے کر کے اتنا مل جاوے گا۔ ہاتھ پیر نہ رہیں گے تو سڑک پر پھنکوا دیجیو۔ اللہ کے نام کے ٹکڑوں پر بڈا پاٹ ہی جاوے گا۔ لو اور سنو، ہم اپنے بیٹے کے گھر رہویں ہیں۔ کسو مال زادی کے یہاں نہیں روٹیاں توڑنے جاویں ہیں۔"

لاکھ ہاجرہ بی نے سمجھانے کی کوشش کی کہ "میں نے تو حساب بتایا تھا۔ میرا خدا نہ کرے یہ مطلب تھوڑی تھا کہ آپ ہمارے اوپر بوجھ ہیں۔" مگر وہ کہاں سننے والی تھیں۔ جو چلی ہے اُن کی راگنی تو پھر رکنے کا نام نہیں۔ خود اپنے خاندان کی سات پشتوں کو یاد کر کر کے ماتم کرتی رہیں۔ باقر میاں رات کو تھکے ہارے ٹکا سا جواب پا کر جوں ہی گھر میں گھسے، اماں جی کا ریکارڈ پھر سے شروع ہو گیا۔ آدھی رات تک جھک جھک ہوتی رہی۔ ہاجرہ نے بھی جل کر میاں کو "نکھٹو" کہہ دیا۔ اور باقر میاں نے حساب کتاب لگا کر ہاجرہ بی کو "پھوہڑ" ثابت کر دیا۔ اور اماں جی نے ان دونوں کو جو کچھ باقی رہا تھا کہہ سنایا۔ مگر کسی کے کلیجے میں ٹھنڈک نہ پڑ سکی۔

qasarulkutub.blogspot.com

ناجرہ بی رات بھر روتی رہیں۔

اماں جی کراہتی رہیں۔

اور باقر میاں ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔

بیچ بیچ میں نسیم ڈراؤنے خواب دیکھ کر روتا رہا۔ اور مہینوں کی جوتم بیزار کے بعد یہ طے ہوا کہ اگر ناجرہ بی عارضی طور پر کام کرنے لگیں تو اتنا زیادہ ہرج تو نہیں جیسے ہی باقر میاں کو نوکری مل جائے گی چھوڑ دیں گی۔

"ہاں جی بس اب میں نے بورڈ کی میٹنگ میں عرضی دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں خود جاؤں گا اسکول کمیٹی کے دفتر، دیکھتا ہوں کیا جواب دیتے ہیں۔"

"کوئی مجھے شوق ہے منحوس نوکری کا، تمہیں نوکری مل جائے تو میں کروں ہی کیوں!"

ناجرہ بی نے اطمینان دلایا۔

"اے بھئی میں کون ہوں رائے دینے والی، قسمت میں جو بدا ہے سو ہوکے گا بی"

اماں جی نے بھی رضامندی ظاہر کی۔

اور ناجرہ بی نے مبلغ باون روپے پر اسکول میں بچوں کی پہلی جماعت کو پڑھانا شروع کیا۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ اس طریقہ تعلیم میں علم سے زیادہ دھموکوں اور طمانچوں کی مانگ ہے۔ صبح سے لے کے شام کے پانچ بجے تک گلا پھاڑ کر بچوں کو ڈانٹنا۔ ان کی مار پٹائی میں اپنی پٹائی کی دھاک بٹھا کر امن قائم کرنا، بڑی اُستانی جی کو رام کرنے کے لئے سارے وقت اُن کے خاندان بھر کے لئے ساڑھیاں، بلاؤز کاڑھنا، سویٹر بننا اور لحاف توشک میں ڈورے ڈالنا۔ ناجرہ بی کی کڑھائی کی وہ دھاک بندھی کہ ہر مہربان نے اتنی ساڑھیاں کڑھوائیں کہ آنکھوں کے آگے تارے ناچ اٹھے۔

ناجرہ بی کو اپنے سلیقہ پر ناز تھا۔ آج وہ سلیقہ گلے میں پھندا بن کر پڑ گیا۔ انکار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ویسے روپے نہیں، اوپر کی کچھ آمدنی ہو ہی جاتی تھی اور کچھ نہیں تو دوپہر کے کھانے کا ہی ٹھکانا ہو جاتا تھا۔ کبھی کوئی ساڑھی کے شکریہ میں مٹھائی یا بسکٹ ہی بچوں کے لئے دے دیتیں۔

سب کو ہی ناجرہ بی کے گھر کا حال معلوم تھا۔ اور کچھ نہ کچھ دیتے دلاتے ہی

رہتے تھے۔ مگر ایک دن جب بڑی اُستانی جی نے کچھ پرانے کپڑے بچوں کے لئے دئے تو ناجرہ بی کو تاؤ آگیا۔ جی چاہا کہہ دیں۔ "اُستانی ہوں بھکارن نہیں ہوں۔" پر کچھ سوچ کر غصہ پی گئیں۔ کیا فائدہ بگاڑ کرنے سے۔ ذرا دو روٹی کا سہارا ہوا ہے۔ کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ مگر گھر آکر کپڑے مہترانی کو دے دئے۔ اماں بی نے فوراً نوٹ کر لیا۔ باقر میاں سے آتے ہی جڑ دیا۔

اچھے بھلے کپڑے مہترانی کو دئے جا رہے ہیں۔ ان کے باپ کے گھر یوں ہی لنگر بٹے تھا۔ جبھی تو کہوں بیٹا، تیری کمائی میں برکت کیوں نہیں۔

جب سے بیوی کو نوکری ملی تھی۔ باقر میاں کا عجیب حال تھا۔ نہ اُگلے بنتی تھی نہ نگلے۔ بس چلتا تو بیوی کو ایک پل نوکری نہ کرنے دیتے۔ یار دوست مذاق ہی مذاق میں چٹکیاں بھرتے۔

"یار عیش ہیں تمہارے تو مزے سے جورو کما کے لاتی ہے۔ بیٹھ کے کھاتے ہو۔ یہاں بیگم کا ہماری وہ نخرہ ہے کہ معاذاللہ! اہل کے پانی نہیں پیتیں، آئے دن زیور اور کپڑے کی فرمائش۔"

"یار سچی بات تو یہ ہے کہ اپن کو بھی یہ آزاد قسم کی بیوی نہیں پسند، اماں عورتوں کا مصرف تو یہی ہے کہ مرد کا جی خوش کرے۔ زیور کپڑے کی فرمائش کرنا تو اس کا حق ہے سالا وہ بھی کیا مرد جو عورت کو زیور کپڑے کو ترسائے۔" دوسرے صاحب فرماتے۔

"بھئی تمہارا ہی جگرا ہے جو بیوی کو تیرے میرے پاس بھیج دیتے ہو یار، قسم خدا کی میں تو خودکشی کر لوں یوں جورو کے ٹکڑوں پہ مجھ سے نہ اینڈا جائے۔"

"ارے یہ بورڈ کے اسکول سالے پرلے درجے کے حرامزادے ہیں۔ یہ اسکول کا نام ہے۔ دراصل چکلے ہیں چکلے۔ بھاگوان تمہاری بیوی تو خیر شریف ہے۔ یہ سالیاں اُستانیاں اوّل نمبر کی وہ ہوتی ہیں۔ یہ سب [illegible] کے کھاتی ہیں۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ارے یار ان اُستانیوں کو دیکھ کے تو قے آتی ہے۔ سالیاں سب کانی کھتری، اجاڑ صورت۔ یہ ممبر سسرے بھی گھامڑ ہوتے ہیں۔ یونہی عشق لڑاتے ہیں کیا تو تھرڈ کلاس مال سے۔ یار ہمارے محلے میں ایک سالی اُستانی تھی یہ پیٹ بھر کے بدصورت

qasarulkutub.blogspot.com

بکری کی سی ٹانگیں برقعے میں سے نکلی ہوئی۔ جب میرے گھر کے سامنے سے گزرتی ہیں تو نالیوں سے بہتا اُن دو سالی پہ کتا۔ یار بڑا مزا آتا تھا۔ لنگڑے کوے کی طرح پُھدکتی بھاگتی تھی۔ بڑی بانساں تتی تھی۔ سالی کو بیٹ رہ گیا۔ نکالی گئی محلے سے جوتے مار کے۔"

ترکش کے تیر باقر میاں کے سینے میں اترتے رہتے اور وہ کھسیاتے ہنس کر بات ٹالتے رہتے۔ رشنی ان سنی کر جاتے۔ جب برداشت کی طاقت شل ہو جاتی تو کسی بہانے سے اُٹھ کر چلے آتے۔ آتے ہی اماں جی دو چار لگاتیں۔

"آج نسیم کو ناشتہ بھی نہیں دیا اور بیگم صاحبہ چلتی بنیں۔ پتہ نہیں یہ اتنے سویرے سے اسکول مٹ گئے ہیں کیا ہو دے ہے۔ میاں ہیں کہ جیسا کنگر باقر میں نے لٹکائے بیٹھی ہوں۔ آج مری کل دوسرا دن مگر مجھے تو تمہارے اوپر ترس آوے ہے کیسے گذر ہوگی۔ ان بچوں پر کیا اثر پڑے گا کہ اماں کا پیر گھڑی بھر کو بھی گھر میں نہیں ٹکے ہے۔"

باقر میاں کا خون کھولتا۔

"آج آجائے حرامزادی، مزہ نہ چکھا دیا تو باپ کا نطفہ نہیں۔"

اسکول کے بعد بڑی اُستانی جی رجسٹروں کی جانچ پڑتال شروع کر دیتیں یا لائبریری کی کتابوں کا فائل لے بیٹھتیں۔ یا امتحان کے پرچے نقل کروانے لگتیں۔ ناجرہ بی کام کرتی جاتیں۔ اور سوچتی جاتیں۔

"ستو بھوکا رہ گیا۔ اللہ اماں جی نے جیسے ناشتہ کرایا کہ نہیں۔ کہیں رات کی دال نہ دے دی ہو۔ کچھ کھٹی سی لگی تھی۔ کہنا بھول گئی۔ پھینک دیتی تو اچھا ہوتا۔ کل دھوبی کپڑے لایا تو ملنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ نہ جانے کیا کیا کھو کے لایا ہوگا۔ شام کو ترکاری سستی ملی ہے۔ آج ستو کے لئے مٹر کی پھلیاں لے لوں گی۔ دودھ پانی ہوتا ہے کمبخت۔ کتنا دُبلا ہوتا جا رہا ہے میرا لال۔ جانے انہیں قمیص ملی ہوگی کہ نہیں۔ ساری قمیصیں پھٹ گئی ہیں۔ اب کے تنخواہ ملے تو دو قمیصوں کا کپڑا لے لوں۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں فکر کے مارے گھلے جاتے ہیں۔" اور اُسے اُس وقت کے باقر میاں یاد آ گئے جب وہ نئی نئی بیاہ کر آئی تھی۔ کپڑوں کا کتنا شوق تھا۔ بھری ہوئی تھی الماری سوٹوں سے۔ انسان پر بڑھاپا آئے سنا ہے۔ یہاں گھر بار ہی بوڑھا ہو گیا۔ باقر میاں تو ابھی جوان ہیں مشکل سے تیس سال کے ہوں گے۔

"... ناجرہ بی، یہ لسٹ تو ایک سرے سے غلط ہے۔" بڑی اُستانی نے چونکا دیا۔

"جی ۔۔؟"

"یہ دیکھو۔۔۔ یہ تو تیسری کلاس کے نمبر ہیں۔ یہ کہاں تم نے پہلی میں ٹھونس دئے تمہارا دل بالکل نہیں لگتا۔ چند دن سے میں دیکھ رہی ہوں تمہاری کلاس میں بھی غل مچتا رہتا ہے۔"

"میں ابھی دوسری لسٹ بنائے دیتی ہوں۔" ناجرہ بی نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا اور کاغذوں پر جھک گئیں۔

بیکاری بھی انسان کو اتنا ہی بدمزاج اور نکما بنا دیتی ہے جتنا ضرورت سے زیادہ بیگار۔ سارے دن کے چڑے ہوئے اور احساسِ کمتری کے کچلے ہوئے باقر میاں نے تھکی ماری ناجرہ بی کو دیکھا تو ایک ایک کر کے سارے زخموں کے مُنہ کھُل گئے۔

"کہاں سے تشریف آرہی ہے رانی دیر میں؟"

"جہنم سے۔" ناجرہ بی نے چڑ کر کہا۔

"اے بھیا، تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔۔۔ کماؤ بیوی ہیں کوئی مذاق ہے۔ بیٹے کو ٹکڑا دیتی ہیں۔ جب جی چاہے گا آویں گی جب چاہے گا جاویں گی۔" دن بھر قینچیاں مارنے کے بعد اماں جی کو ذرا منہ کو ہوا بھی تو دینا تھی! لہٰذا آگ پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔

"میں پوچھتا ہوں کہاں لگائی اتنی دیر؟" باقر میاں بہت ضبط کر کے بولے۔

"سلیم۔۔۔ ارے ستو۔۔۔ بیٹے!" ناجرہ بی نے چاہا کچھ نہ سنے۔ کچھ نہ دیکھے نہیں تو اس کے دماغ میں سے ایک لپکتا ہوا شعلہ نکلے گا جو کائنات کو بھسم کر ڈالے گا۔

"ہم بات پوچھ رہے ہیں اور تو ادھر اُدھر کی ہانکیاں بتا رہی ہے حرامزادی۔۔۔۔ اُلو کی پٹھی۔" باقر میاں نے خوفناک انداز میں اُٹھتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا۔

ناجرہ بی نے باقر میاں کی نیم پاگل آنکھوں میں دیکھا اور سہم گئی۔ مگر خوف نے زبان پر اور بھی زہر گھول دیا۔

"کمائی کرنے گئی تھی اور کہاں جاتی۔"

qasaurduclub.blogspot.com

"کمائی کی بچی . . . . یہ اتنی شام تک کمائی ہو رہی تھی۔

"کہو۔ تو کل سے نہیں جاؤں گی" ماجرہ بی نے چڑانے کو مسکرا کر کہا۔ "ایسا ہی بڑا عزت کا خیال ہے تو خود کیوں نہیں کماتے؟ یہ خوب ہے۔ سارا دن یہاں لعنت بھیجا مار کے آؤ اور اوپر سے میاں بنو۔ بڑے بڑے اینڈتے ہو۔ عورت ہو کے میں کماؤں، مرد سے تصور لیتے ہو، اور پر سے غراتے ہو" ماجرہ بی جانتی تھی وہ سب جھوٹ کہہ رہی ہے۔ باقر میاں نے کتنے دن ہو گئے تھے چٹخارے لے کر کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ لاکھ پوچھتی "ٹھیک ہے نمک؟" "اوں؟" وہ چونک کر بیٹھتے "ہاں ہاں سب ٹھیک ہے" اور پھر اپنے خیالوں کے جال میں اُلجھ کر ڈوب جاتے۔ مگر اس وقت اُس کا جی چاہ رہا تھا، کوئی باقر میاں کا قیمہ کر کے کتوں کو کھلا دے۔

گالم گلوچ، جوتم پیزار، حسب پروگرام روزانہ کی طرح بیٹنگ پر لٹھے رہتے اور بیچ بیچ میں، اماں بی کے تیل کے چھینٹے۔ اور کچھ تو نہیں، بس یہی۔

"کہو بھلا میاں ہے کہ پاؤں کی پیزار ساری ہم تے تو اپنے خصم کے آگے کدی منہ نہ کھولوں۔ ہاں بھئی نکھٹو میاں اور چھیلا گُتا کسی کو نہیں بھاتا۔"

پھر پیٹ کی پکار دم بھر کے لئے زخموں پہ کھرنڈ بنا دیتی، سر جھکا کر خاموش منہ چلتے رہتے۔ دل سلگتے رہتے۔ باقر میاں کھری چارپائی پر پڑے بیڑی پھونکا کرتے۔

"اُٹھئے، بستر کر دوں" وہ نرمی سے کہتی۔

"رہنے دو" رکھائی سے جواب ملتا۔

"اب ان نخروں سے کیا فائدہ" وہ کوئی نرم بات کہنا چاہتی۔ مگر نرم باتیں تو جیسے خواب ہو گئی تھیں۔

"کہہ دیا ایک دفعہ۔ رہنے دو" باقر میاں غراتے اور ماجرہ بی اپنی پلنگڑی پر پڑ کر گئی بیتی زندگی کے سہانے خوابوں میں کھو جاتی۔ جیسے وہ خواب کسی غیر کے ہوں۔

کتنے دن ہو گئے تھے وہ دونوں ایک دوسرے سے پیار سے نہیں بولے تھے۔ نوکری کے بعد باقر میاں اُس سے دور تر ہوتے چلے گئے۔ ہوں ہاں کے سوا۔

بات ہی بند کر دی۔ وہ سمجھتی تھی اُس کی اِس قربانی کو سراہا جائے گا۔ ساس کے کچوکے کم ہو جائیں گے۔ میاں کا پیار تو ملے گا۔ میاں کما کر لاتا ہے تو بیوی اُس کے عوض میں اپنا پیار دیتی ہے۔ اگر بیوی کما کر لائے تو کیا میاں کا یہ فرض نہیں کہ وہ کم از کم اُسے اپنے پیار سے تو محروم نہ کرے۔ آخر اُس کا قصور کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ سب کو فاقوں سے بچا رہی ہے۔ بجائے شاباشی دینے کے محلّے کی عورتیں اُسے حقارت سے دیکھتی ہیں۔ جیسے وہ بازاری عورت ہو اور وہ پاک دامن گرہستنیں۔ کیا وہ بھوکا مر جانے دیتی تو پارسائی بڑھ جاتی۔ محلّے کے مردوں کو اس کا احسان مند ہونا چاہئے تھا کہ وہ اُن کی جنس کے ایک فرد کا کام انجام دے رہی ہے۔ ایک کمانے والا مرد فرعون، اور کمانے والی بیوی مجرم! خیر اُسے دُنیا سے نہیں، باقر میاں سے شکایت تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اُنہوں نے اُسے پیار سے کلیجے سے نہیں لگایا تھا۔ اُن کے محبت بھرے لمس کے لئے اُس کا تھکا ماندہ جسم ترس گیا تھا۔ آج کل وہ بیکار سارا سارا دن خاموش پڑے رہتے۔ ایک دن وہ تھا جب نوکری سے عاجز تھے کہ پیار کے لئے وقت نہیں ملتا، تو اُس کا جی چاہتا تھا ہر دن اتوار ہی رہے اور اب جب کہ زندگی ایک مسلسل اتوار بن گئی تھی۔ اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ کیا وہ دن کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے؟ کیا وہ میاں بیوی کی زندگی ہی میں بیوہ ہو گئی۔

خدا نے جیسے اُن کی ایک سایہ سا اپنے اوپر جھکا ہوا محسوس ہوا۔ باقر میاں اُسے سوتا سمجھ کر ٹٹول کر جانے لگے۔ تڑپ کر ماجرہ نے اُن کی آستین پکڑ لی۔ سلیم کی طرح باقر میاں سسکیاں لیتے اُس کے بازوؤں میں آ گئے۔ ساری غربت، ساری کثافت دو پیار کرنے والوں کے آنسوؤں نے دھو ڈالی۔ کتنے دُبلے ہو گئے تھے باقر میاں! اُس کا گلا بھر آیا۔ اُن کے گالوں میں اتنی [illegible] کبھی نہ تھیں۔ جیسے صدیوں کے بعد وہ اُن سے ملی ہو۔ کتنا حسین تھا یہ جسم شادی کی رات!

وہ اُس کے بازو میں غافل سو رہے تھے۔ جیسے برسوں کے جاگے ہوں۔ اب وہ اسی طرح سویا کریں گے۔ کل سے وہ اپنی کھال اُتار کر اُن کے قدموں کے نیچے بچھا دے گی، نہ جلنے گے پسینے سے سر میں تیل بھی تو نہیں ڈالا۔ یہ اُن کے بھرے بھرے ہاتھوں کو کیا

qasarulkutub.blogspot.com

ہو گیا۔ جیسے بانس کی کھپچیاں! چپکے چپکے وہ اُن کی ایک ایک اُنگلی کو چومتی رہتی۔ آہستہ آہستہ کہ کہیں وہ جاگ نہ جائیں۔ اُس کا بازو سُن ہو گیا۔ مگر وہ ہلی نہیں۔ بہت دن بعد سوئے تھے باقر میاں!

اُس نے خواب میں دیکھا۔ باقر میاں کو نوکری مل گئی ہے۔ وہ اسکول جا رہے ہیں۔ اُس نے خواب ہی میں گلوری دی تو اُنہوں نے اُس کی اُنگلی میں آہستہ سے دانت گڑو دیئے۔ ساری کائنات گدگدی سے مچل پڑی اور ساجرہ کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اُسے جھنجھوڑ کر اُٹھا رہا تھا۔

"اُٹھ نصیبوں جلی، تیرا ارمان پورا ہو گیا!" اماں بی سر پیٹ کر کہہ رہی تھیں۔ "ہائے ڈائن، میرے لال کو کھا گئی!"

بچھو پھوپی

جب پہلی بار میں نے اُنھیں دیکھا تو وہ رحمان بھائی کے پہلے منزلے کی کھڑکی میں بیٹھی لمبی لمبی گالیاں اور کوسنے دے رہی تھیں۔ یہ کھڑکی ہمارے صحن میں کھلتی تھی اور قانوناً اُسے بند رکھا جاتا تھا کیونکہ پردے والی بی بیوں کا سامنا ہونے کا ڈر تھا۔ رحمان بھائی رنڈیوں کے جمعدار تھے، کوئی شادی، بیاہ، ختنہ، بسم اللہ کی رسم ہوتی، رحمان بھائی اونے پونے ان رنڈیوں کو بلا دیتے اور غریب کے گھر بھی وحیدہ جان، مشتری بائی اور انوری کہروا ناچ جاتیں۔

مگر محلے ٹولے کی لڑکیاں بالیاں اُن کی نظر میں اپنی سگی ماں بہنیں تھیں۔ اُن کے چھوٹے بھائی بندو اور گیندا آئے دن تاک جھانک کے سلسلے میں رپٹول کیا کرتے تھے۔ ویسے رحمان بھائی محلے کی نظروں میں کوئی اچھی شہرت نہیں رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی بیوی کی زندگی ہی میں اپنی سالی سے جوڑ توڑ کر لیا تھا۔ اس یتیم سالی کا سوائے اس بہن کے اور کوئی مرا جیتا نہ تھا۔ بہن کے ہاں پڑی تھی۔ اُس کے بچے پالتی تھی۔ بس دودھ پلانے کی کسر تھی۔ باقی سارا گو موت وہی کرتی تھی۔ اور پھر کسی نک چڑھی نے اُسے بہن کے بچے کے

qissarulkutub.blogspot.com

منہ میں ایک دن چھاتی دیتے دیکھ لیا۔ بھانڈا پھوٹ گیا اور پتہ چلا کہ بچوں میں آدھے بالکل "خالہ" کی صورت پہ ہیں۔ گھر میں رحمان کی دُھن چلا ہے۔ بہن کی دُرگت بناتی ہوں پر کبھی بچوں میں اقرار نہ کیا۔ یہی کہا کرتی تھیں، "جو کنواری کو کہے گا، اُس کے دیدے گھٹنوں کے آگے آئے گا" یہ ہاں بر کی تلاش میں مرحوم سوکھا کرتی تھیں، پر اس کیڑے بھرے کباب کو کہاں جُڑتا؟ ایک آنکھ میں یہ بڑی کوڑی سی پتلی تھی۔ پیر بھی ایک ذرا چھوٹا تھا، کولی دبا کر چلتی تھی۔

سارے محلے سے ایک عجیب طرح کا بائیکاٹ ہو چکا تھا۔ لوگ رحمان بھائی سے کام پڑتا تو دھونس جما کر کہہ دیتے۔ محلے میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی یہی کیا کم عنایت تھی۔ رحمان بھائی اُسی کو اپنی عزت افزائی سمجھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر طول طویل گالیاں دیا کرتی تھیں۔ کیونکہ باقی محلے کے لوگ ابا سے دبتے تھے، مجسٹریٹ سے کون بیر مول لے۔

اُس دن پہلی دفعہ مجھے معلوم ہوا کہ ہماری اکلوتی سگی پھوپی بادشاہی خانم ہیں اور یہ لمبی لمبی گالیاں ہمارے خاندان کو دی جا رہی تھیں۔

اماں کا چہرہ فق تھا اور وہ اندر کمرے میں سہمی بیٹھی تھیں، جیسے کچھ پھوپی کی آواز ان پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے گی۔ پچھلے چھ ماہ سے اسی طرح بادشاہی خانم رحمان بھائی کی کھڑکی میں بیٹھ کر ہنکارتیں، ابا میاں اُن سے ذرا سی آڑ لے کر مزے سے آرام کرسی پہ دراز اخبار پڑھتے رہتے اور موقع محل پر کسی لڑکے بالے کے ذریعے کوئی ایسی بات جواب میں کہہ دیتے کہ پھوپی بادشاہی پھر شتابیاں چھوڑنے لگتیں۔ ہم لوگ سب کھیل کود، پڑھنا لکھنا چھوڑ کر صحن میں گچھا بنا کر کھڑے ہو جاتے اور مُڑ مُڑ اپنی پیاری پھوپی کے کوسنے سُنا کرتے۔ جس کھڑکی میں وہ بیٹھی تھیں وہ اُن کے طول طویل جسم سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ ابا میاں سے اتنی ہم شکل تھیں جیسے وہی مونچھیں اُتار کر دوپٹہ اوڑھ کر بیٹھ گئے ہوں۔ اور باوجود کوسنے اور گالیاں سُننے کے ہم لوگ بڑے اطمینان سے اُنھیں تکا کرتے تھے۔

ساڑھے پانچ فٹ کا قد، چار اُنگل چوڑی کلائی، شیر کا سا کلّا، سفید بگلا بال، بڑا سا دہانہ، بڑے بڑے دانت، بھاری سی ٹھوڑی! اور آواز تو ماشاء اللہ ابا میاں سے ایک

سُر نیچی ہی ہو گی۔

پھوپی بادشاہی ہمیشہ سفید کپڑے پہنا کرتی تھیں۔ جس دن پھوپا مسعود علی نے مہترانی کے سنگ کلیلیں کرنی شروع کیں پھوپی نے بیٹے سے ساری چوڑیاں چھنا چھن توڑ ڈالیں۔ رنگا دوپٹہ اُتار دیا اور اُس دن سے وہ اُنہیں "مرحوم" یا "مرنے والا" کہا کرتی تھیں۔ مہترانی کو چھونے کے بعد اُنھوں نے وہ ہاتھ پھر اپنے جسم کو نہ لگنے دئے۔

یہ سانحہ خاصی جوانی میں ہوا تھا اور وہ جب سے "رنڈاپا" جھیل رہی تھیں۔ ہمارے پھوپا ہماری اماں کے چچا بھی تھے۔ ویسے تو نہ جانے کیا گھپلا تھا، میرے ابا میری اماں کے چچا لگتے تھے۔ اور شادی سے پہلے جب وہ چھوٹی سی تھیں تو میرے ابا کو دیکھ کر اُن کا پیشاب نکل جاتا تھا اور جب اُنھیں یہ معلوم ہوا کہ ان کی منگنی اسی بھیانک دیو سے ہونے والی ہے۔ تو اُنھوں نے اپنی دادی یعنی ابا کی پھوپی کی پٹاری سے افیون چُرا کر کھا لی تھی۔ افیون زیادہ نہیں تھی اور وہ کچھ دن لوٹ پوٹ کر اچھی ہو گئیں۔ اُن دنوں ابا علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے۔ اُن کی بیماری کی خبر سُن کر امتحان چھوڑ کر بھاگے۔ بڑی مشکل سے ہمارے نانا جو ابا کے پھوپی زاد بھائی بھی تھے اور بزرگ دوست بھی، اُنھوں نے سمجھا بجھا کر واپس امتحان دینے بھیجا تھا۔ جتنی دیر وہ رہے، بھوکے پیاسے ٹہلتے رہے۔ ادھ کھلی آنکھوں سے میری اماں نے اُن کا چوڑا چکلا سایہ پردے کے پیچھے بے قراری سے تڑپتے دیکھا۔

"اُمراؤ بھائی! اگر نہیں کچھ ہو گیا۔ ۔ ۔ تو۔ ۔ ۔" دیو کی آواز لرز رہی تھی۔ نانا میاں خوب ہنسے۔

"نہیں برادر! خاطر جمع رکھو، کچھ نہ ہوگا۔"

اس وقت میری ننھی سی معصوم اماں ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اُس کے دل سے ایک دم دیو زاد انسان کا خوف نکل گیا تھا۔ جبھی تو میری پھوپی بادشاہی کہتی تھیں، میری اماں جادوگرنی ہے اور اُس کا تو میرے بھائی سے شادی سے پہلے تعلق ہو کر پیٹ گرا تھا۔ میری اماں اپنے جوان بچوں کے سامنے جب یہ گالیاں سُنتیں تو ایسی بسور بسور کر روتیں کہ بس ان کی مامتا فراموش ہو جاتی اور پیار آنے لگتا۔ مگر یہ گالیاں سُن کر ابا کی گمبھیر آنکھوں میں پریاں ناچنے لگتیں۔ وہ بڑے پیار سے ننھے بھائی کے ذریعے کہلواتے

dasarulkutub.blogspot.com

"کیوں پھوپی، آج کیا کھایا ہے؟"

"تیری میّا کا کلیجہ!" اس بے تکے جواب سے پھوپی جل کر مرندا ہو جاتیں۔ "ابا بچہ جواب دلواتے۔"

"ارے پھوپی اب تو نہ کھائیں، بواسیر ہو گئی ہے جلاب تو جلاب!"

وہ میرے نوجوان بھائی کی جوانی اور نئی نویلی پر تو دن بھیا دن کو دعوت دینے لگتیں۔ اُن کی جھلس کو جی نہ جانے، بیچارگی اس وقت کہاں بیٹھی اپنے خیالی دولہا کے عشق میں لرز رہی ہوگی، رنڈاپے کی دعائیں دیتیں اور میری اماں کانوں میں انگلیاں دے کر بڑبڑاتیں "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو!"

پھر ابا آ سکتے اور ننھے بھائی پوچھتے۔

"پھوپی بادشاہی، مہترانی پھوپی کا مزاج تو اچھا ہے؟" اور پھوپی اُڑ کر کہیں کھڑکی میں سے پھاند نہ پڑیں۔

"ارے جا سنپولے، میرے منہ نہ لگ، نہیں تو جوتی سے منہ مسل دوں گی۔ یہ بڈھا اندر بیٹھا کیا لونڈوں کو سکھا رہا ہے۔ مغل بچہ ہے تو سامنے آ کر بات کرے۔"

"رحمان بھائی، اے رحمان بھائی، اس بوڑھی کُتیا کو سنکھیا کیوں نہیں کھلاتے۔" ابا کے سکھانے پہ ننھے بھائی ڈرتے ڈرتے بولتے حالانکہ انہیں ڈرنے کی کوئی ضرورت تو نہ تھی۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ آواز اُن کی ہے مگر الفاظ ابا میاں کے ہیں۔ لہٰذا گناہ ننھے بھائی کی جان پہ نہیں۔ مگر پھر بھی بالکل ابا کی شکل کی پھوپی کی شان میں کچھ کہتے ہوئے انہیں پسینے آ جاتے تھے۔

کتنا زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہمارے ددھیال اور ننھیال والوں میں۔ ننھیال حکیموں کی گلی میں تھی اور یہ ددھیال گاڑی بانوں ٹھپے ہیں۔ ننھیال والے سلیم چشتی کے خاندان سے تھے جنہیں مغل بادشاہ نے مرشد کا مرتبہ دے کر نجات کا راستہ پوچھا تھا۔ ہندوستان میں اُسے ایسے عرصہ گزر چکا تھا۔ نہ نکیلے ستواں ناک تھی، نقوش نرم پڑ چلے تھے، مزاج ٹھنڈے ہو گئے تھے۔

ددھیال والے باہر سے سب سے آخری کھیپ میں آنے والوں میں سے تھے۔ ذہنی طور پر ابھی تک گھوڑوں پر سوار منزلیں مار رہے تھے۔ خون میں لاوا دہک رہا تھا۔ کھڑے

کھڑے تلوار جیسے نقوش، لال فرنگیوں جیسے منہ، اژدہوں جیسی قد و قامت، شیروں جیسی گرجدار آوازیں۔ شہتیر جیسے ہاتھ پاؤں۔

اور ننھیال والے، نازک ہاتھ پیروں والے، شاعرانہ طبیعت کے دھیمی آواز میں بولتے چالتے کے عادی۔ زیادہ تر حکیم، عالم اور مولوی تھے۔ جیسی محلے کا نام حکیموں کی گلی پڑ گیا تھا۔ کچھ کاروبار میں بھی حصّہ لینے لگے تھے، شال باف، زردوز اور عطار وغیرہ بن چکے تھے۔ حالانکہ میری ددھیال والے ایسے لوگوں کو کنجڑے قصائی ہی کہا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ خود زیادہ تر فوج میں تھے۔ ویسے مار دھاڑ کا شوق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کشتی پہلوانی، تیراکی میں نام پیدا کرنا، پنجہ لڑانا، تلوار اور پٹے کے ہاتھ دکھانا اور چوسر پچیسی کو جو میری ننھیال کے مرغوب ترین کھیل تھے، ہیجڑوں کے کھیل سمجھنا۔

کہتے ہیں جب آتش فشاں پہاڑ پھٹتا ہے تو لاوا وادی کی گود میں اُتر آتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ یہ ددھیال والے ننھیال والوں کی طرف خود بخود کھنچ کر آ گئے۔ یہ میل کب اور کس نے شروع کیا۔ سب شجرے میں لکھا ہے مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں۔ میرے دادا ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے۔ دادیاں بھی اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں مگر ایک چھوٹی سی بہن بن بیاہی تھی۔ نہ جانے کیوں کر وہ شیخوں میں بیاہ دی گئی۔ شاید میری اماں کے دادا نے میرے دادا پر کوئی جادو کر دیا تھا کہ انہوں نے اپنی بہن بقول پھوپی بادشاہی کنجڑے قصائیوں میں دے دی۔ اپنے "مرحوم" شوہر کو گالیاں دیتے وقت وہ ہمیشہ اپنے باپ کو قبر میں چین نہ ملنے کی بددعائیں دیا کرتیں۔ جنہوں نے چغتائی خاندان کی مٹی پلید کر دی۔

میری پھوپی کے تین بھائی تھے۔ میرے تایا، میرے ابا میاں اور میرے چچا۔ بڑے دو اُن سے بڑے تھے اور چچا سب سے چھوٹے تھے۔ تین بھائیوں کی ایک لاڈلی بہن ہمیشہ کی نخریلی اور تنک مزاج تھیں۔ وہ ہمیشہ بیٹوں پر رعب جماتیں اور لاڈ کرواتیں۔ بالکل لونڈوں کی طرح پلیں، شہسواری، تیر اندازی اور تلوار چلانے کی بھی خاصی مشق تھی۔ ویسے تو پھیل پھال کر ڈھیر معلوم ہوتی تھیں مگر پہلوانوں کی طرح سینہ تان کر چلتی تھیں۔

بیمنہ تھا کبھی چار عورتوں جنتا۔

ابا مذاق میں اماں کو چھیڑا کرتے۔

"بیگم! بادشاہی سے کشتی لڑو گی؟"

"اوئی تو یہ میری کیا عالم فاضل باپ کی بیٹی، میری اماں کان پر ہاتھ دھر کر کہتیں، مگر وہ ننھے بھائی سے فوراً پھوپی کو چیلنج بھجوا دیتے۔

"پھوپی بی، ہماری اماں سے کشتی لڑو گی۔"

"ہاں، ہاں، بلا اپنی اماں کو۔ آجائے خم ٹھونک کر، ارے اگر تیرا نا دوں تو مرزا کریم بیگ کی اولاد نہیں۔ باپ کا نطفہ ہے تو بلا۔ بلا لا اپنی کو [illegible]" اور میری اماں اپنا لکھنؤ کا بڑے پائنچوں کا پاجامہ سمیٹ کر کوٹھے میں دبک جاتیں۔

"پھوپی بادشاہی، دادا میاں گنوار تھے نا؟ بڑے نانا جان انھیں کلام اللہ پڑھایا کرتے تھے۔ ہمارے پرنانا کے دادا جان نے کبھی دادا میاں کو کچھ پڑھا دیا ہوگا۔" ابا میاں چھیڑنے کو بات توڑ موڑ کر کہلواتے۔

"ارے وہ استنجے کا ڈھیلا کیا میرے باوا کو پڑھاتا۔ مجاور کہیں کا، ہمارے ٹکڑوں پہ پلتا تھا۔" یہ سلیم چشتی اور اکبر بادشاہ کے رشتے سے حساب لگایا جاتا ہم لوگ یعنی چغتائی اکبر بادشاہ کے خاندان سے تھے، جنھوں نے میری ننھیال کے سلیم چشتی کو پیر و مرشد کہا تھا۔ مگر پھوپی کہتیں، "خاک، پیر و مرشد کی دُم! مجاور تھے مجاور۔"

تین بھائی تھے، مگر تینوں سے لڑائی ہو چکی تھی۔ اور وہ غصہ ہوتیں تو تینوں کی دھجیاں بکھیر دیتیں۔ بڑے بھائی بڑے اللہ والے تھے، انھیں حقارت سے فقیر اور بھیک منگا کہتیں۔ ہمارے ابا گورنمنٹ سروس میں تھے، انھیں غدار اور انگریزوں کے غلام کہتیں، کیوں کہ مغل شاہی انگریزوں نے ختم کر دی، ورنہ آج "مرحوم" بیگی دال کے کھانے والے جولاہے۔ یعنی میرے پھوپا کے بجائے وہ لال قلعے میں زیب النساء کی طرح عرق گلاب میں غسل فرما کر کسی ملک کے شہنشاہ کی ملکہ بنی بیٹھی ہوتیں۔ تیسرے یعنی چچا بڑے دس نمبر کے بدمعاشوں میں سے تھے اور سپاہی ڈرتا ڈرتا مجسٹریٹ بھائی کے گھر ان کی حاضری لینے آیا کرتا تھا۔ انھوں نے کئی قتل کیے تھے، ڈاکے ڈالے تھے۔ شراب اور رنڈی بازی میں اپنی مثال آپ

تھے۔ وہ انھیں ڈاکو کہا کرتی تھیں جو ان کے کیریئر کو دیکھتے ہوئے قطعی بے تُکا لفظ تھا۔

مگر جب وہ اپنے مرحوم شوہر سے غصہ ہوتیں تو کہا کرتیں، "منہ جلے، نگوڑی نامی نہیں ہوں۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ اُن کو خبر ہو گئی، تو دُنیا کا نہ رہے گا۔ اور کچھ نہیں، اگر چھوٹا سُن لے تو بیچ میں انتڑیاں نکال کے ہاتھ میں تھما دے، ڈاکو ہے ڈاکو ـــــ اُس سے بچ گیا تو منجھلا مجسٹریٹ تجھے جیل میں سڑا دے گا۔ ساری عمر چکیاں پسوائے گا اور اس سے بھی بچ گیا تو بڑا جو اللہ والا ہے، تیری عاقبت خاک میں ملا دے گا۔ دیکھ مغل بچی ہوں تیری اماں کی طرح شیخانی فتانی نہیں۔" مگر میرے پھوپا اچھی طرح جانتے تھے کہ تینوں بھائی اُن ہی پر رحم کھاتے ہیں اور وہ بیٹھے مسکراتے رہتے ہیں، وہی میٹھی میٹھی زہریلی مسکراہٹ جس کے ذریعے سے میرے ننھیال والے ددھیال والوں کو برسوں سے جلا رہے ہیں۔

ہر عید بقر عید کو میرے ابا میاں بیٹوں کو لے کر عیدگاہ سے سیدھے پھوپی اماں کے ہاں کوسنے اور گالیاں سننے جایا کرتے، وہ فوراً پردہ کر لیتیں اور کوٹھڑی میں سے میری جادوگرنی ماں اور ڈاکو ماموں کو کوسنے لگتیں۔ نوکر کو بلا کر سویاں بھجواتیں۔ مگر یہ کہتیں "پڑوسن نے بھیجی ہیں۔"

"ان میں زہر تو نہیں ملا ہوا ہے؟" ابا چھیڑنے کو کہتے۔ اور پھر ساری ننھیال کے بھتیجے بکھیر لے جاتے۔ سویاں کھا کر ابا عیدی دیتے جو وہ فوراً زمین پر پھینک دیتیں کہ "اپنے سالوں کو دو۔ وہی تمھاری روٹیوں پر پلے ہیں۔" اور ابا چپ چاپ چلے آتے اور وہ جانتے تھے کہ پھوپی بادشاہی وہ روپے گھنٹوں آنکھوں سے لگا کر روتی رہیں گی۔ بھتیجوں کو وہ آڑ میں بلا کر عیدی دیتیں۔

"حرامزادو! اگر اماں ابا کو بتلایا تو بوٹیاں کاٹ کر کتوں کو کھلا دوں گی۔" اماں ابا کو معلوم تھا کہ لڑکوں کو کتنی عیدی ملی۔ اگر کسی عید پر کسی وجہ سے ابا میاں نہ جا پاتے تو پیغام پر پیغام آتے "نصرت خانم بیوہ ہو گئیں، چلو اچھا ہوا۔ میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔" ایسے پیغام شام تک آتے ہی رہتے اور پھر وہ خود رحمان بھائی کے کوٹھے پر سے گالیاں سنانے آجاتیں۔

ایک دن عید کی سویاں کھاتے کھاتے کچھ گرمی سے جی مالش کرنے لگا۔ ابا میاں کو

qasarulkutub.blogspot.com

اُلٹی ہو گئی۔

"لو بادشاہی خانم! کہا سنا معاف کرنا، ہم تو چلے۔" ابا میاں نے کراہ کر آواز بنائی اور پھوپی بستر پر وہ جھپٹیں، چھاتی کوٹتی نکل آئیں۔ ابا کو شرارت سے ہنستا دیکھ اُلٹے پاؤں کوستی لوٹ گئیں۔

"تم آ گئیں بادشاہی تو ملک الموت بھی گھبرا کر بھاگ گئے، ورنہ ہم تو آج ختم ہی ہو جاتے۔" ابا نے کہا۔ نہ پوچھیے پھوپی نے کتنے وزنی کوسنے دئے۔ اُنھیں خطرے سے باہر دیکھ کر بولیں۔

"اللہ نے چاہا بجلی گرے گی۔ نالی میں گر کر دم توڑو گے۔ کوئی میت کو کاندھا دینے والا نہ بچے گا۔" اور ابا چڑانے کو اُنھیں دو روپے بھجوا دیتے۔

"بھئی ہماری خاندانی ڈومنیاں گالیاں دیدیں تو اُنھیں بیل تو ملنی ہی چاہئے۔" اور پھوپی بوکھلاہٹ میں کہہ جاتیں۔

"بیل دے اپنی اماں بہنیا کو۔" اور پھر فوراً اپنا منہ پیٹنے لگتیں تو خود ہی کہتیں "اے بادشاہی بندی تیرے منہ کو کالک لگے۔ اپنی میت آپ پیٹ رہی ہے۔" پھوپی کو اصل میں بھائی سے ہی بیر تھا۔ بس اُن کے نام پر آگ لگ جاتی، ویسے کہیں ابا کے بغیر اماں نظر آجاتیں تو گلے لگا کر پیار کرتیں۔ پیار سے "پھُچّو پُھچّو" کہتیں۔ "بچے تو اچھے ہیں۔" وہ بالکل بھول جاتیں کہ یہ بچے اُسی بدذات بھائی کے ہیں جسے وہ ازل سے ابد تک کوستی رہیں گی۔

اماں اُن کی بھتیجی بھی تو تھیں، یعنی کس قدر گھپلا تھا۔ میری ددھیال ننھیال ہیں۔ ایک رشتے سے میں اپنی اماں کی بہن بھی لگتی تھی۔ اس طرح میرے ابا میرے دولہا بھائی بھی ہوتے تھے۔ میری ددھیال کو ننھیال والوں نے کیا کیا غم نہ دئے۔ غضب تو جب ہوا جب میری پھوپی کی بیٹی مسرت خانم ظفر ماموں کو دل دے بیٹھیں۔

ہوا یہ کہ میری اماں کی دادی یعنی ابا کی پھوپی جب لب دم ہوئیں تو دونوں طرف کے لوگ تیمارداری کو پہنچے۔ میرے ماموں بھی اپنی دادی کو دیکھنے گئے۔ اور مسرت خانم بھی اپنی اماں کے ساتھ اُن کی پھوپی کو دیکھنے آئیں۔

بادشاہی پھوپی کو کچھ ڈر خوف تو تھا نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میرے ننھیال والوں

کی طرف سے اُنھوں نے اپنی اولاد کے دل میں اطمینان بخش حد تک نفرت بھر دی ہے اور پندرہ برس کی مسرت خانم کا ابھی سن ہی کیا تھا۔ اماں کے کولھے سے لگ کر سوتی تھیں۔ دودھ پیتی ہی تو اُنھیں لگتی تھیں۔

پھر جب میرے ماموں نے اپنی کرنجی شربت بھری آنکھوں سے مسرت جہاں کے لچکدار سراپے کو دیکھا تو وہیں کی وہیں جم کر رہ گئیں۔

دن بھر بڈھے بوڑھے تیمارداری کر کے تھک ہار کر سو جاتے تو یہ فرمانبردار بچے سرہانے بیٹھے مریضہ پر کم ایک دوسرے پر زیادہ نگاہ رکھتے۔ جب مسرت جہاں برف میں تر کپڑا بڑی بی کے ماتھے پر بدلنے کو ہاتھ بڑھاتیں تو ظفر ماموں کا ہاتھ وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔

دوسرے دن بڑی بی نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ لرزتی کانپتی گاؤ تکیے کے سہارے اُٹھ بیٹھیں، اُٹھتے ہی سارے خاندان کے ذمہ دار لوگوں کو طلب کیا۔ جب سب جمع ہو گئے تو حکم ہوا "قاضی کو بلواؤ۔"

لوگ پریشان کہ بڑھیا قاضی کو کیوں بلا رہی ہے، کیا آخری وقت سہاگ رچائے گی؟ کس کو دم مارنے کی ہمت تھی۔

"دونوں کا نکاح پڑھاؤ۔" لوگ چکرائے کن دونوں کا۔ مگر اُدھر مسرت جہاں بیہوش ہو کر گریں اُدھر ظفر ماموں بوکھلا کر باہر چلے۔ چور پکڑے گئے۔ نکاح ہو گیا، بادشاہی پھوپی سناٹے میں رہ گئیں۔

حالانکہ کوئی خطرناک بات نہ ہوئی تھی، دونوں نے صرف ہاتھ پکڑے تھے۔ مگر بڑی بی کے لئے بس یہی حد تھی۔

اور پھر جو بادشاہی پھوپی کو دورہ پڑا ہے تو بغیر گھوڑے اور تلوار کے بغیر انہوں نے کشتوں کے پشتے لگا دئے۔ کھڑے کھڑے بیٹی داماد کو نکال دیا۔ مجبوراً ابا میاں دولہا دولہن کو اپنے گھر لے آئے۔ اماں تو چاند سی بھابی کو دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ بڑی دھوم دھام سے ولیمہ کیا۔

qasrulkutub.blogspot.com

بادشاہی پھوپی نے اُس دن سے پھوپی کا مُنہ نہیں دیکھا۔ بھائی سے پردہ کرلیا۔ میاں سے پہلے ہی کٹا چھنی تھی۔ دُنیا سے مُنہ پھیرلیا۔ اور ایک زہر تھا کہ ان کے دل و دماغ پر چڑھتا ہی گیا۔ زندگی سانپ کے پھن کی طرح ڈسنے لگی۔

"بڑھیا نے پوتے کے لئے میری بچّی کو پھنسانے کے لئے مکر کا ٹھاٹھ تھا۔"

وہ برابر یہی کہے جاتیں۔ کیوں کہ لڑکی وہ اس کے بعد بیس سال تک اور جئیں۔ کون جانے ٹھیک ہی کہتی ہوں بچھو پھپی۔

مرتے دم تک بہن بھائی میں میل نہ ہوا۔ جب ابّا میاں پر فالج کا چوتھا حملہ ہوا اور بالکل ہی وقت آگیا تو اُنھوں نے پھوپی بادشاہی کو کہلا بھیجا۔

"بادشاہی خانم، ہمارا آخری وقت ہے۔ دل کا ارمان پورا کرنا ہو تو آجاؤ۔"

نہ جانے اس پیغام میں کیا تیر چھُپے تھے۔ بھیّا نے پھینکے اور بہنیا کے دل میں ترازو ہو گئے۔ ہلہلاتی، چھاتی کوٹتی، سفید پہاڑ کی طرح بھونچال لاتی ہوئی بادشاہی خانم اُس ڈیوڑھی پر اُتریں جہاں اب تک اُنھوں نے قدم نہیں رکھا تھا۔

"لو بادشاہی، تمھاری دُعا پوری ہو رہی ہے۔" ابّا میاں تکلیف میں بھی مُسکرا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں اب بھی جوان تھیں۔

پھوپی بادشاہی باوجود بالوں کے وہی مُنّی سی بچھو لگ رہی تھیں جو بچپن میں بھائیوں سے مچل مچل کر بات منوالیا کرتی تھیں۔ اُن کی شیر جیسی خرانٹ آنکھیں ایک میمنے کی معصوم آنکھوں کی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے آنسو اُن کی سنگ مرمر کی چٹان جیسے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

"ہمیں کوسو بچھو بی!" ابّا نے پیار سے کہا۔ میری امّاں نے سسکتے ہوئے بادشاہی خانم سے کوسنے کی بھیک مانگی۔

"یا اللہ ۔ ۔ ۔ ۔ یا اللہ ۔ ۔ ۔ ۔" اُنھوں نے گرجنا چاہا۔ مگر کانپ کر رہ گئیں۔ "یا ۔ ۔ ۔ یا اللہ ۔ ۔ ۔ میری عمر میرے بھیّا کو دیدے ۔ ۔ ۔ ۔ یا مولا ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے رسولؐ کا صدقہ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ اُس بچے کی طرح جھجھلا کر

رو پڑیں۔ جیسے سبق یاد نہ ہو۔

سب کے مُنہ فق ہوگئے۔ امّاں کے پیروں کا دم نکل گیا۔ یاخدا۔ آج پھوپی کے مُنہ سے بھائی کے لئے ایک کوسنا نہ نکلا۔

صرف ابّا میاں مسکرا رہے تھے جیسے اُن کے کوسنے سُن کر مسکرا دیا کرتے تھے۔

سچ ہے، بہن کے کوسنے بھائی کو نہیں لگتے۔ وہ ماں کے دودھ میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔

qasarulkutub.blogspot.com

کلّو کی ماں

جمّو بجیا کے بیاہ کا جوڑا دھوم دھڑاکے سے سِل رہا تھا۔ چچی بی اور اماں جی میں دھواں دھار بحث ہو رہی تھی۔ چچی بی مصر تھیں کہ چمپا طوئی کا زمانہ گیا۔ نئے فیشن کی رو سے نین کے اوپر تلے اسنبولی بیل اور گنگا جمنی کرن خوب کھِلے گی۔ اماں جی کہتی تھیں:

"کرن موئی لفنگی دو گھڑی میں بٹ کر سُتلی ہو جاوے ہے۔ چمپا برسوں جمی رہوے ہے۔"

بجیا اپنے جہیز سے دور بے تعلق سی بیٹھی بچوں کے سنگ کوٹ پیس کھیل رہی تھیں مگر جی اُن کا بنت اور گوکھرو میں اُلجھا ہوا تھا۔ وہ ان دیدے کا پانی ڈھلی کنواریوں میں سے نہ تھیں جو کھٹّے بند دل بیٹھ کر اپنا جہیز سیتی ہیں۔ کبھی اُن سے کچھ ٹنکوانا ہوتا تو چچی بی کہتیں:

"جمّو بیٹی ذرا بیرے کرنے پہ مخمل کے پھول ٹانک دو۔" بجیا سمجھ جاتیں مگر بھول ل ٹانک دیتیں۔ سب کے سامنے نہیں۔ دالان در دالان لے جا کر چچی بی نے پسنتی کریب کے دوپٹے پر ٹانچی کی بنت کے آس پاس اسنبولی بیل اور گنگا جمنی کرن جما کر پوچھا۔

"کیوں جمّو کیا لگتی ہے؟"

بجیا شرم سے کنارہ ہوگئیں اور بوکھلاہٹ میں اپنے آری سے پتہ ٹپ مار دیا۔ اماں جی نے کہا "رہنے دے دولہن۔ خدا خیر کرے، تمہاری تو جانو مت ماری گئی ہے۔ اسے وہ بچاری کیا بولے گی۔"

مگر کہنا چچی بی کا ماننا پڑا۔ چچی بی تھیں بھی فیشن ایبل۔ پونچھوں کے بال کا فیشن وہ اپنے میکے سے لائیں جو سارے محلے میں وبا کی طرح پھیل گیا۔ کاشغاری سیندھ تک پوتی تھیں۔ سرخ پتنگ کا کاغذ جس میں زیور بندھ کر آتے ہمیشہ اُن کی پاندان کی ڈبیا میں اڑسا رہتا۔ سب کی آنکھ بچا کے پان کھاتے وقت ہونٹوں پر کاغذ تھوک سے تر کر کے گھِسّا مار لیتیں اور اُن کے حسابوں لپ اسٹک لگ جاتی۔ کرن کے حق میں فیصلہ ہونے کے بعد جوڑا سِلنے لگا۔ چندھی متیا نے ترنگ میں آکر لرزتی بلغم بھری آواز میں نیوڑے گانے شروع کر دیئے، ایک دم جیسے سب کے دلوں میں شہنائیاں بج اٹھیں، شادیوں کا موسم سا ٹوٹ پڑا۔ جوڑے پہ جوڑے لگائے جانے لگے۔ رفیق میاں کی رضیہ بی سے، فریدہ بی کی بنّو میاں سے، رشید میاں کی صغرا بی سے ڈور باندھی جانے لگی۔

"تو کس سے بیاہ کرے گا رے؟" مذاق میں چچی بی نے چھبّو سے پوچھا۔

"تم سے!" دو برس کے چھبّو نے ماں کی گود میں مچل کر فیصلہ کیا۔ سب ہنس پڑے۔ بات چل نکلی ہی گئی۔ یہاں تک کہ کنواری بجیا کے ہونے والے لڑکے یا لڑکی کا بھی جوڑا لگا دیا گیا۔ کلّو کی ماں دہلیز پر بیٹھی دھنیا کی گری کوٹ رہی تھیں۔ ترنگ میں آکر بولیں:

"اے رے نکٹے تو کس سے بیاہ کرے گا؟"

"چھابہ بی بی سے!" پانچ برس کے کلوے نے گُنیا کانوں والی نوشابہ بی کی طرف پیار سے دیکھ کر کہا۔ اور چھابہ بی بی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ سب ہی ہنس پڑے مگر چچی بی کا شہابی رنگ تمتما کر قرمزی ہو گیا۔ اُٹھا جوتی تڑاتڑ کلوے کی ناک، منہ اور سر پہ جڑ دیں۔ ہنسی میں کھنڈت ہو گئی۔ تاشے کے بیچ بھینک پھاڑ کر جمّو بجیا روتے ہوئے چھبّو کو کوٹھے پر لے کے ٹھمکنے لگیں۔ دادی جی نے بسورتی ہوئی چھابہ کو گود میں سمیٹ لیا۔ کلّو کی ناک سے جیتے جیتے خون کی تلّی بہنے لگی۔ کلّو کی ماں چھاتی پیٹ پیٹ کر دھاڑی۔

qasarulkutub.blogspot.com

"ہائے میرے پوت کو مار ڈالا۔ ہائے میرا بن باپ کا بچہ۔"

"کلو کے کا ... خیرات کے ٹکڑوں پہ پلنے والا۔ اور اُس کے یہ لچھن، موری کا کیڑا اور دماغ آسمان پہ۔" چھّی بی کا پٹھان خون کھول کر لاوا بن گیا۔ "حرامزادے کو روٹیاں لگی ہیں۔"

"ہے ہے، دلھن! سید بچہ ہے۔" اماں جی نے سر پیٹ لیا۔ "اس کی بساط ہی کیا۔ تم کاہے کو اپنی عاقبت سنوارو۔"

"چولھے میں پڑے سید بچہ اور بھاڑ میں جائے سیادت۔ میری بچی کی طرف آنکھ اُٹھا کے دیکھا تو دیدے نکال لوں گی۔" اماں جی روکتی رہیں پر چھّی بی بپھر چکی تھیں۔

کلو کی ماں نے اوپر سے دو دھموکے کلو کی پیٹھ پر اور جمائے اور اس کی سات پشتوں کو کوسنے لگیں۔

"اے تجھے ڈھائی گھڑی کی آوے۔ باوا کو کھا گیا اب جنم جلی کے سر چھپانے کی جگہ موئی سو وہ بھی ملیامیٹ کر کے دم لے گا ــ خدائی خوار، نامراد۔" وہ اُسے گھسیٹتی ہوئی باورچی خانے میں لے گئیں۔

کلو کی ماں ویسے ہماری دور کی خالہ تھیں۔ پر دوستوں کو خالہ کہہ لیتے۔ پر اُنھیں خالہ کہتے عار سی آتی۔ امتیازاً نوکر نہ کہتے۔ پر کلو کی ماں ضرور کہتے۔ گرتے گرتے اُن کی پوزیشن نوکروں جیسی ہو گئی تھی۔ نہ وہ جہاں کہیں جاتیں، نہ چار دن کی مہمان داری کے بعد لوگ ڈھیرے ڈھیرے اُنھیں ... آتے۔ ماما کھسکا دی جاتی۔ اور وہ بغیر تنخواہ کے صرف پھٹے پرانے کپڑے اور روٹی پہ ماما کا عہدہ سنبھال لیتیں۔ میاں لام پہ گئے، سو نہ جانے کس کی گولی کھا کر ڈھیر ہو گئے۔ امتیازی خالہ کا تو کسی لال منہ والے سے بیر بھی نہ تھا۔ پر اللہ جانے کس اللہ کے بندے نے اُن کی مانگ اُجاڑ دی۔

تنخواہ کا کوئی ذکر نہیں۔ بھلا اپنے رشتہ داروں کو تنخواہ دے کر کون ذلیل کر سکتا ہے! ہاں عید بقر عید پر ... "اور "دولہا بھائی سلام" کے صلے میں اٹھنی اماں جی سے اور روپیہ ابا جی سے ضرور مل جاتا تھا اور دوسرے نوکروں کی طرح "بیگم صاحب"

نہیں کہنا پڑتا تھا بلکہ آپا اور دولہا بھائی کہنے کا فخر حاصل تھا۔

کلو کی ماں جو یوں تیرے میرے در پہ ماتھا رگڑتی تھیں اُس کی بھی ایک وجہ تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اُن کا کلو لکھ پڑھ کر کسی قابل ہو جائے اور وہ راج جو نہ میاں کے دم سے نہ کرسکیں، کلو کے دم سے نصیب ہو۔ اتنے بچے پڑھتے ہیں، ایک کلو بھی پڑھ جائے گا، مگر کلو کے سپرد ہزاروں ڈیوٹیاں تھیں۔ چھّی بی کی کمر دبانی، دوپہر کو پیر کے انگوٹھے میں رسّی کھینچنا۔ تھجے تھجے پانی پلانا۔ ایک دم سارے گھر کو ہی پیاس لگ جاتی۔ کلو کو ایک مشک پانی کٹورہ کٹورہ کر کے ڈھونا پڑتا۔ چھبو اور چھابہ کے ساتھ کھیلنا، ہزار بار جھنجنا گرائے تو اُٹھانا۔ چھابہ بی کی گڑیا کو ایک منٹ میں چھتیس بار ڈوپٹہ اُڑھانا۔ مہترانی سے پوتڑے دھلوانے کے لئے پانی ڈالنا۔ اتنا وقت ہی کہاں ملتا تھا جو کلو علم و ادب کی طرف رجوع کرتا۔ ویسے مولوی صاحب مفت کا اُلّو پڑھانے کے قائل بھی نہ تھے۔ کلو کے کپڑے بھی تو اس قابل نہ ہوتے تھے کہ وہ سب بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ سکے۔

ہمارے ہاں باورچی تھا اس لئے ماماگیری سے تو کلو کی ماں کو نجات ملی ہوئی تھی۔ مگر گیہوں پھٹکنا، دالیں بیننا، مسالے کوٹنا، بچوں کو نہلانا دھلانا، جنس تلواتا، کسی کے ہاں بچہ ہو تو راتوں کو زچہ کے سرہانے جاگنا کہ کہیں بلّی حرام خور نال کی بسوند سے لگی چلی آئے اور بچے کو چبا کے نہ رکھ دے۔

کلو جب ... کا ہو گا کہ شامت آ گئی۔ نہ میت اُٹھی، نہ جنازہ آیا، نہ تربت بنی، بس ایک ... چوڑیاں ٹھنڈی کر دیں۔ کانچ کی چوڑیوں اور دو پیسے ہیلے کے گلابی فیروزی رنگ سے ... جوان بیوہ کس کو بھاوے۔ جہاں گئیں نکلنا پڑا۔ اُڑتی بھٹکتی ہمارے ہاں آ کر دم لیا تھا۔ تو کلو کی عشق بازی نے پیر اُکھاڑ دیئے۔ دو چار پیغام بھی آئے۔ خود شوقین مزاج چھوٹے چچا نے ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی۔ مگر کلو کی ماں نے کھونٹے پہ ہاتھ نہ دھرنے دیا۔

"نہ میاں، میرا پوت جوان ہو گا تو کیا کسی کو منہ دکھاؤں گی کہ میاں نے خصم کر لیا۔" ویسے وہ چچا کی شادیوں کی لت سے بھی واقف تھیں۔ بیاہتا بیوی پر تنبولن لا بٹھائی، تنبولن پہ بساطن، اس پہ دھوبن، میراثن اور بھنگن کا نزول ہوا، غرض میاں نے کوئی "بن" با

qasarulkutub.blogspot.com

تن من چھوڑی۔ اور جب اُن کی بیویوں میں جوتم پیزار بڑھتی وہ ایک نئی بکھیڑی لاکر چھوڑ دیتے۔ اُن کے حصے کے دالان میں یتیم خانہ کھلا ہوا تھا۔ کلّو کی ماں میں دم درود بھی نہیں تھا۔ پچیس برس کی عمر میں کھکھوڑا اُن ہو کر رہ گئی تھیں۔ صورت پہ مکھیاں بھنکتی تھیں۔ ازلی رنڈاپا برستا تھا۔ آئے دن نیم تلے کھٹیا پہ لحاف اوڑھے جوڑی بخار سے کشتی لڑا کرتیں۔ ویسے کوئی کام کی چیز کو کاہے کو بیاہے۔ مفت کی نوکرانی کسے بُری لگتی ہے۔

اُسی شام اُنھوں نے بخار میں کھنکتے ہوئے کلّو کو کندھے سے لگایا اور پڑوس میں نواب ممتاز کے شاگرد پیشے میں جا پڑیں۔

نواب صاحب کا بھرا پُرا گھر تھا۔ پڑھے لکھے فیشن ایبل لڑکے لڑکیاں، بہوئیں کوٹھی کے شاندار احاطے میں آئے دن ڈنر پارٹیاں ہوتیں اور اسی کوٹھی کے ایک گمنام سے کونے میں نواب صاحب بڑے زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ دو سال سے اُن کی اب تب ہو رہی تھی۔ مگر جاتو اللہ میاں سے پٹہ لکھا کر لائے تھے۔ اچھے بھلے جوان لڑھک جائیں۔ پر بڈھا ٹس سے مس نہ ہو۔ ایک تو دُنیا بھر کی بیماریاں جن میں پُرانی پیچش اور گٹھیا پیش پیش۔ اوپر سے بُڈھے کا دماغ ساتویں آسمان پر۔ مُنہ پر وُہ مغلظات کہ کوئی نوکر آٹھ دن سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔ کلّو کی ماں کے بھاگوں ان کا نوکر بھاگا ہوا تھا۔ لہٰذا سات روپے مہینہ اور کھانا اور سال میں دو جوڑ سوسی کے کپڑوں پر وہ نواب صاحب کی نرس کے طور پر رکھ لی گئیں۔ ہمارے خاندان کی تو ناک کٹ گئی۔ نواب صاحب کے ہاں سے پہلے ہی لین دین بند تھا۔ وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے تھے۔ اب تو اور بھی تن گئی۔

نہ جانے کلّو کی ماں کی تیمارداری نے رنگ دکھایا یا بڈھا ضد باندھ رہا تھا، بجائے سانسوں کی ڈور ٹوٹنے کے اور مضبوط ہو گئی۔ اور بڈھا بدمزاجی کا ٹھیکیدار تھا۔ بیچاری سر جھکا کر اُن کی گالیاں کوسنے سُنا کرتیں۔ کوٹھی میں قہقہے گونجا کرتے اور وہ بیٹھی بڈھے کی قے سمیٹا کرتیں۔

اور پھر بڑے میاں کی گالیوں میں کمی آنے لگی۔ گلاس، رکابی مار پھینکنے کی عادت میں بھی کمی آ گئی۔ کبھی کبھی ترنگ میں آکر سرہانے سے اکنی نکال کر کلّو کو دیتے۔ "کیوں بے

کیا لے گا؟" وہ اُس سے مذاق میں پوچھتے۔

"جی، روشنائی۔"

"روشنائی! ابے گھاس کھا گیا ہے؟ گزک بھیجیو، اچھا۔"

"جی اچھا۔" کلّو سہمی ہوئی آواز میں کہتا۔

ایک دن کلّو کی ماں نے مُنہ دُھلا کر سلابچی اُٹھائی تو بڑے میاں بڑی نرم آواز میں بولے۔

"کلّو کی ماں، تم میری پوتیوں کے برابر ہو۔ پر نامحرم سے یہ گو موت کراتے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں گناہ کر رہا ہوں۔ اب بڑھاپے میں مرتے وقت عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو نکاح کر لو۔"

کلّو کی ماں سے سلابچی چھوٹتے بچی۔ کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ اور دیر تک بے سُدھ پڑی رہیں۔ پھر ایک دم جی بھر آیا۔ اور خواب بھڑاس نکالی۔ ہائے مرنے والے، یہ تم نے کس قصور کی سزا دی۔

شام کو جب وہ بیڈ پین لے کر آئیں تو بڑے میاں تکیے کے سہارے بیٹھے تھے۔

"مجھے حاجت نہیں۔ ابھی کریم آیا تھا۔ اُس نے فراغت کرا دی۔" اُنھوں نے ذرا سوکھی آواز میں کہا۔ اور کلّو کی ماں کا خون خشک ہو گیا۔ یا مولا! اب کتنی سیڑھیاں باقی رہ گئی ہیں۔ سر چکرایا اور وہ دروازے سے ٹک گئیں۔

"سردے کی دو پھانکیں تو ورق لگا کے لے آؤ۔" بڑے میاں اپنی روکھی کھردری آواز میں بولے۔ آنکھ جھپک کر کلّو کی ماں سردے کی قاشیں لے آئیں۔ ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف بڑے میاں کی ڈھیلی بتیسی کی چپڑ چپڑ سنائی دے رہی تھی۔ بڑے میاں کچھ نادم، کچھ جھینپے سے سردے کے قتلے چبھتے رہے۔ کلّو کی ماں کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

اتنے میں چق کے پیچھے سے کلّو کی آنکھیں چمکیں۔ ماں نے اشارے سے بھگانا چاہا مگر بڑے میاں بولے۔

"آنے دو نا بچے کو۔" کلّو دبا دبا آیا۔ اور گھبراہٹ چھپانے کو کبھی ایک پیر پر

qasarulkutub.blogspot.com

اور کبھی دوسرے پیر پر ڈگمگاتا رہا۔

"کچھ پڑھتا وڑھتا بھی ہے یا بس ڈنڈے بجاتا ہے؟" پاس بلا کر وہ کلّو سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ کلّو کی ماں جب اُن کی بتیسی دھو کر لائیں تو بڑے میاں کو چھ کا پہاڑا سنا رہا تھا۔ اور وہ آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے۔ ماں کے اشارے پر کلّو باہر جانے لگا تو بڑے میاں غرّائے۔

"ہم سو نہیں رہے ہیں کلیم الدین۔"

کلیم الدین ——— بڑے بڑے آنسو کلّو کی ماں کی آنکھوں میں بھر آئے، کلیم بچپن سے ہو گیا۔ بس کلّو کا باپ یوں کلیم الدین لکھا کرتا تھا۔ "کلیم الدین کو پیار" اُس کے آخری خط میں بھی تھا۔ پر اب تو وہ دُنیا میں کلّو ہی بن کر رہ گیا تھا۔ اور وہ اس گمنام سے کلّو کی ماں! ——— منہ پھیر کر جب وہ خالی رکابی اُٹھانے لگیں۔ تو پھر گرجے۔

"ہم پہاڑا سن رہے ہیں۔ دیکھیں پاجی کو کچھ یاد بھی ہے یا نہیں۔ ہاں بھئی تو چھ ستے؟"

"بیالیس" کلّو نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ اور کلّو کی ماں کا دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا۔

بڑے میاں نے پھر نکاح کی بات نہیں چھیڑی۔ مگر کلّو سے اُن کی دوستی یارانے کی حد کو پہنچ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ اُن کے بستر پر بیٹھنے لگا۔ دونوں دو پتیا کھیلتے تو بڑے میاں خوب بے ایمانی کرتے۔ اور کلّو اُن سے جھگڑتا۔ اُن کے بستر پر بیٹھنے کے لئے کلّو کو کپڑے بھی صاف پہنانے پڑتے۔ ویسے اب اُسے کام کاج نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے اتنا میلا بھی نہ ہوتا تھا۔ ایک دن تاش کھیلتے کھیلتے ایک دم بولے "چودہ پنجے؟"

"اکیاسی۔"

"ایں!" بڑے میاں غرّائے "کیا کہا؟ اکیاسی! کریم خاں، اس اُلّو کے پٹھے مولوی کی داڑھی پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو۔"

جب مولوی صاحب آئے تو بڑے میاں ہنکارے۔

"سنئے مولوی صاحب! ہاں بھئی کلیم الدین، چودہ پنجے؟"

"اکیاسی" کلّو نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

"سنا آپ نے مولوی صاحب؟ چودہ پنجے اکیاسی! بچے کو آپ اپنا سر پڑھاتے ہیں؟"

بڑے میاں نے مولوی صاحب کی گھنٹہ بھر ٹانگ کھینچی۔ پھر کلّو کی ماں کی چار گھنٹے جان سولی پر کر دی اور اُس دن سے مولوی صاحب برآمدے میں بیٹھ کر کلّو کو سبق دینے لگے۔ سنگ سوار ہو جاتی تو بڑے میاں، مولوی صاحب اور کلّو دونوں کا دھوبی گھاٹ کر دیتے۔

صاف ستھرے پوتوں نواسوں کو کہاں اتنی فرصت تھی جو اپنی نرسری اور کنڈر گارٹن سے پڑھتے کھچ پچ میں سڑتے ہوئے دادا میاں کے پاس آتے۔ کئی کئی دن گزر جاتے۔ کوئی پلٹ کر نہ پوچھتا۔ لوگ منتظر تھے کب بڑے میاں مریں اور ان کا دھوم دھام سے چالیسواں ہو۔ پیار کا بھوکا کلّو بڑے میاں کی سنسان بوڑھی زندگی میں تر و تازہ پھول کی طرح کھل اُٹھا۔ دو پیار کے ترسے ہوئے ایک چھوڑ ہزار جان سے ایک دوسرے پر عاشق ہو گئے۔ گھنٹوں دونوں میں ایسے گھل مل کر باتیں ہوتیں، جیسے وہ ہم سن ہوں۔

"ابے کلیم، فاختہ نے دانہ کھا لیا؟"

"نہیں ابا جی، چاول ویسے کے ویسے پڑے ہیں۔"

"اماں، [illegible] ہو گئے۔ فاختہ چاول پر منہ نہیں مارے گی۔ اُسے کودوں دو۔" اور دونوں سر جوڑ کر فاختہ کو کودوں کھلاتے۔ فاختہ ایک دانہ کھا لیتی تو بڑے میاں کا چلّوؤں خون بڑھ جاتا۔

اور ایک دن بڑے میاں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جب کلّو کی اماں نے انہیں لاٹھی کے سہارے دوسرے ہاتھ سے کلّو کا کندھا پکڑے صحن میں کیاریوں

qasarulkutub.blogspot.com

سے پاس دیکھا تو کلیجے میں گولی سی لگی۔

کوٹھی میں بم پھٹ پڑا جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ رات کو دادا میاں نے کلو کی ماں سے نکاح پڑھوا لیا۔ بیس ہزار مہر نقد بنک میں اور نہر والی کوٹھی جس کا ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کرایہ آتا تھا۔

"میں نہ کہتی تھی، وہ آنکھ کا ناسور ہے" مرچی بی نے کہا۔ حالانکہ یہ پیشگوئی انہوں نے اسی دم گھڑی تھی۔

ہفتوں کلو کی ماں اور دادا میاں کے چرچے محلے والے نمک مرچ لگا کر کرتے رہے۔ ایک شاعر قسم کے نوجوان نے تو ان پر نظم تک کہہ ڈالی۔ خاندان والوں کی لے دے سے تنگ آ کر بڑے میاں نے اپنی طرف کے دروازے میں اینٹیں چنوا دیں۔ سب کی محبت پھر پھڑا کے جاگ اٹھی۔ اور لاوارث بڈھا سب کا چہیتا بن گیا۔ مگر ضدی بڈھے کے منہ لگنا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں کلو کی ماں کے جادو میں آ کر رہی سہی جائداد نہ دے ڈالے۔ اور مفت کے عیش میں چنگاری پڑ جائے۔

نکاح کی رات جب رفع حاجت کے بعد تسبیحی دھو کر گلاس میں ڈال کر سرہانے رکھنے گئیں تو وہ اور کلو دو معصوم بچوں کی طرح گلے میں باہیں ڈالے بے خبر سو رہے تھے۔ مچھر دانی درست کر کے کلو کی ماں برآمدے میں اپنی مخصوص پلنگڑی پر لیٹیں تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ ایک چھتنار برگد کی چھاؤں میں لیٹی ہیں۔ بے اختیار کانوں میں اپنی بارات کے تاشے تڑتڑانے لگے۔ انار پھلجھڑیاں چھوٹ کر دماغ میں جگنوؤں کی طرح پھیل گئیں۔ وہ مانجھا جو تھی برسی ایک ایک کر کے ذہن کی پگڈنڈی پر گزرنے لگیں۔ عمر ہی کیا تھی۔ رحیم بھی تو کم سن ہی تھا مہندی سے لال ہاتھ کئی دن یار دوستوں سے چھپائے پھرا تھا اور پھر گھر کی اندھیری کوٹھریوں اور سنسان چھتوں پر وہ جوان ہوئے۔ پھر کلو نے ان کو موتی کھتروں کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ مگر بنتے ہی دنیا اجڑ گئی۔

کلو کی ماں کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ مرنے والے کی جوان چوڑی چکلی چھاتی سانس روکنے لگی۔ تھکے ہارے مسافر کی طرح کلو کی ماں نے اس غیر مرئی چھاتی پر ماتھا ٹکا دیا۔ جو سنگ مرمر کی طرح سرد اور بے جان تھی۔ ایک انجانی گولی اس چھاتی کو چیرتی ہوئی معصوم کلو اور بدنصیب ماں کے وجود کو پاش پاش کر گئی۔

qasarulkutub.blogspot.com

نیند

ایک دم رات انتہا سے زیادہ سنسان اور تھکی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ وہی رات جو چند لمحے پہلے نشے میں چور، نو بیاہتی کی دلہن کی طرح جگر مگر کر رہی تھی یکایک بوڑھی اور مریضہ بن گئی ——— اُنھوں نے اپنے بازو پر سوئے نوعمر جوان کے بھاری سر کا بوجھ ذرا کھسکا کر اور قریب کر لیا۔ وہ بے سُدھ سو رہا تھا۔ اُس کی لمبی لمبی سڈول ٹانگیں مسہری سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ پہلو کے نیچے مڑا ہوا تھا۔ دوسرا بھاری شہتیر کی طرح اُن کے سینے پر پڑا ہوا تھا۔

کیا جی لگا کر سو رہا تھا نیک بخت! اگر اس کی سرمئی آنکھیں اُس وقت کھلی ہوئی ہوتیں تو ننھی ننھی بالوں کے گچھے اُس کی پتلیوں پر لٹک جاتے۔ اُس کے صندلی گالوں پر نصف رات کی سبزی جھلک آئی تھی۔ لب وا تھے اور وسکی کی میٹھی میٹھی مہک آ رہی تھی۔

نوعمر لڑکا سو رہا تھا اور وہ جاگ رہی تھیں۔ اُس کی گہری نیند پر اُنھیں شدت سے رشک آ رہا تھا۔ اُن کے بازو پر سر رکھتے ہی وہ فوراً سو گیا تھا اور خراٹے لینے لگا تھا۔ بالکل دودھ پیتے بچے کی طرح اُس کے خراٹے نرم و نازک اور غنودگی کے سُروں میں

ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کے شانوں پر مسلسل وقفے سے ایک ہلکی سی گرم لہر رینگ جاتی تھی۔

وہ جاگ رہی تھیں۔ کیوں کہ اُن کے جسم سے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ کتنا دور تھا، کتنے سال درمیان میں گہری گہری کھائیوں کی طرح حائل تھے اور وہ زندگی کی سنگلاخ ترین چٹان پر معلق تھیں۔ نوجوان سپاہی اُن سے دور خوابوں کی دُنیا میں اپنی ڈارلنگ شہنو کو بانہوں میں جکڑے اُس کے ہونٹ چوم رہا تھا۔ اور اُن کے برباد اور سنسان دل کو اس نیند کی دُنیا سے دُور اکیلا چھوڑ گیا تھا۔

اُن کی نیند کا خزانہ ختم ہو چکا تھا۔ برسوں سے وہ لوٹ ہو کر سونے کا مزا بھول چکی تھیں۔ اب نیند کی دواؤں کا بھی اُن پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے بڑی سختی سے اُنھیں گولیوں کی مقدار گھٹانے کی تاکید کی تھی۔ کبھی وہ دن بھی تو تھے جب اُن پر الغاروں نیند ٹوٹ پڑا کرتی تھی۔ جاگنے کے لئے چائے اور کافی بھی بے کار ثابت ہوتی تھیں۔ گیارہ بجے سے ہی اُن کی آنکھیں لڑکھڑانے لگتی تھیں۔ ایک بار تو وہ رقص کے درمیان میں اپنے پارٹنر کی بانہوں میں چند لمحوں کے لئے غافل ہو گئی تھیں۔ اگر اُن کا پارٹنر اتنا قوی ہیکل نہ ہوتا تو وہ اُنھیں یوں بانہوں میں اُٹھائے اُٹھائے ہرگز نہ رقص کر پاتا۔

اور اگر اُنھیں اپنے پارٹنر کی بے جواں مردی کی ادا بے طرح نہ بھا گئی ہوتی تو شاید آج اُن کی زندگی بالکل مختلف دھاروں میں بہہ رہی ہوتی۔ یہ جب کی بات تھی جب اُن کی شادی کو چند ہی سال ہوئے تھے۔ اور جب تک اُن کے شوہر اتنے باسی اور پرانے نہیں ہوئے تھے۔ یہ دونوں سوسائٹی میں نئے نئے داخل ہوئے تھے اور اونچے طبقے کے رنگین دل لوگوں نے بڑے جوش و خروش سے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ نئے بیاہے سلمان اور شہنو کی جوڑی بھی خوب تھی۔ سلمان سبک قد کے حسین و جمیل نوجوان تھے۔ اُن کی آنکھوں میں معصومیت تھی اور آواز میں سحر تھا۔ سوسائٹی کی اُکتائی ہوئی بیگمیں بہت جلد اُن کی بھولی بھالی صورت پر لٹو ہو گئیں۔ شہناز جنھیں سب پیار سے شہنو کہا کرتے تھے بڑی البیلی واقع ہوئی تھیں۔ اگر اُن کا ناک نقشہ حُسن کے

qasarulkutub.blogspot.com

مقررہ پیمانے سے تولا جاتا تو بڑے گھاٹے میں رہتیں۔ مگر اُن کی پرسنیلٹی غضب کی تھی "ڈاٹ" کی نوازی ہوئی تھی۔ اپنے قد میں بلا کی لچک تھی۔ ایک تو جسم کا توبہ شکن اُتار چڑھاؤ، اوپر سے اُن کا نوکیلا بلیک فٹنگ لباس، سونے پر سہاگے کا کام کرتے تھے۔

اُف وہ بھی کیا دن تھے جب لوگوں کی نگاہیں اُن کے تعاقب میں بھٹکا کرتی تھیں۔ کچھ حاسد قسم کے لوگوں کا تو خیال تھا کہ سلمان صاحب کو شہنو طرار لنگ کی بدولت ہی اتنی ہر دلعزیزی حاصل تھی۔ کچھ احمق سمجھتے تھے کہ خوش مذاق خواتین سلمان کی وجہ سے شہنو سے بنا یا چنانے میں پیش پیش تھیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نیند ٹوٹ کر آتی تھی۔ سرِ شام ہی سے آنکھیں میٹھی میٹھی ہونے لگتی تھیں۔ تب اُن کا حسن دو بالا ہو جاتا اور لوگ اُنھیں کسی شرط پہ ٹکٹکی دیتے ——

پارٹیوں سے آکر کیسی دُھواں دھار نیند آتی تھی۔ اِطمینان تو صبح دفتر چلے جاتے۔ وہ نرم نرم بستر پر پھیل پھیل کر سوتے جاتیں۔ مشکل کھانے کے وقت پر اُٹھتیں۔ پر نیند کھٹکے جاتی، آنکھیں نڈھال ہوئی جاتیں۔ نہا دھو کر ذرا کی ذرا آنکھیں کھُلتیں، پھر تھوڑی سی ٹیبر کے سامنے کھانا کھاتے ہی جسم کے جوڑ جوڑ میں نیند رینگنے لگتی۔ پڑھنے کی کوشش کرتیں تو کتاب بار بار منہ پر گرنے لگتی۔

پر اب جیسے نیند کی تھیلیاں ہی سوکھ گئی ہوں۔ وقت شیطان کی آنت بن کر ہولے ہولے سرکتا —— اور نیند نہ آتی۔ آتی بھی تو ایسی اُچٹتی ہوئی بیگانی سی، کہ سو کر بھی بے خوابی کا کھردرا احساس طاری رہتا۔

اُن کا ہاتھ دب جانے سے دورانِ خون رُک کر سُن ہو گیا۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے نیند سے بوجھل سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچا، شہتیر جیسے بازو کو جسم کی طاقت لگا کر سرکایا، اور کہنی کے بل ہو کر وہ عطری کے نوجوان کو تکنے لگیں۔ ان ہنگامہ خیز چند گھنٹوں میں اچھی طرح اُس کے نقش و نگار کو بھی نہیں دیکھ پائی تھیں، وہ تھا بھی بیکل بوٹی۔ جوانی اُس کی رگ رگ میں قلانچیں بھر رہی تھی۔ نچلا بیٹھتے اُسے نقصان ہونے لگتی تھی۔ اُنہوں نے زندگی میں بڑے بڑے شرابی دیکھے تھے۔ ہنستے ہوئے، روتے ہوئے —— اُلٹیاں کرتے ہوئے۔ کپڑوں میں رفعِ حاجت کرتے ہوئے۔ مگر ایسا شرابی اُنھوں نے

کبھی نہ دیکھا تھا۔ جتنی وہ چند گھنٹوں میں پی گیا دوسرے کئی دن میں نہ پی پاتے۔ پھر لُطف یہ کہ نہ پیروں میں لرزش، نہ زبان میں لکنت —— اُن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ گیا، مگر وہ چاق چوبند رہا، پیتا رہا، رقص کرتا رہا۔ اُس ایک شام اُس نے نہ جانے کتنے میل رقص کر ڈالا ہوگا۔

شروع ہی میں وہ اتنا پئے ہوئے تھا کہ اُنہوں نے مسز دوراب جی سے کہہ کہہ ہی اس جنگلی سے بچنا چاہا۔ اس بھوت سے تو کوئی سانڈنی ہی نپٹ سکتی تھی، مگر بدقسمتی کہ وہ دوسری خواتین پہلے ہی مشغول تھیں۔ ورنہ اس چھوکرے کے لئے تو بقول مسز دوراب جی اُنھیں اُلٹے دام مل جاتے۔ پھر تھوڑی دیر جبراً بھگتنے کے بعد اُنہیں اُس پہ پیار آگیا، وہ اکیلا تھا، بہت ہی اکیلا تھا۔ اُس کی ماں بچپن میں مر چکی تھی اور باپ اُلّو کا پٹھا تھا۔ دوسرے اُسے شہنو سے پیار ہو گیا تھا۔ اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔ وہ نوکری چھوڑ دیگا۔ ساری دُنیا کو گولی مار دے گا۔ بس وہ اور شہناز ساری عمر یوں ہی چکنے فرش پہ ناچتے رہیں گے۔ یہ فیصلہ اُس نے چند گھنٹوں کے بعد ہی کر لیا تھا۔

جھک کر اُنھوں نے کھڑکی میں سے آتی ہوئی صبحِ کاذب کی دودھیا روشنی میں نیند میں متوالے فوجی نوجوان کو ایک بار پھر دیکھا۔ سوتے میں اُس نے پٹ کر سوئے ہوئے بچّے کی طرح سسکی بھری جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہو۔ محاذ سے زندہ سلامت آنے والے بھی اپنی روح کا کوئی نامعلوم سا حصّہ وہیں خاک اور خون میں تڑپتا چھوڑ آتے ہیں اور جب نیند کی رانی اُنھیں بے دست و پا بنا کر خواب میں وہیں گھسیٹ لے جاتی ہے تو وہ معصوم بچّوں کی طرح بسورنے لگتے ہیں۔

"فرید بھی تو سوتے میں یوں ہی بسورا کرتا تھا ——" اُنھوں نے سوچا۔

فرید کی یاد بجلی بھری تلوار کی طرح چمک کر دل میں ترازو ہو گئی۔ وہ کتنی کم سن تھیں جب فرید پیدا ہو گیا تھا۔ کیا گندا سا لال بوٹی جیسا بچہ، دیکھ کر اُبکائی آگئی تھی، پلپلے ستلی کے کیڑے کو دیکھ کر ہی اُن کا جی متلانے لگا تھا۔ ویسے بھی فرید کی آمد ہی اُن کی سوشل لائف کے حق میں موت کا پیغام ثابت ہوئی۔ ڈرتہ پارٹیوں میں پیٹ پھلائے کیسے جاتیں! کتنا جھوٹ بولتے ہیں یہ دُنیا والے کہ جب بچّہ ماں کی چھاتی منہ میں لیتا ہے تو

dasarulkutub.blogspot.com

روم روم میں ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ انہیں تو ایسی تکلیف ہوئی تھی کہ چیخیں نکل گئی تھیں۔ پھر ڈاکٹر سلمان نے کوشش کی۔ انھوں نے بچے کو جسم سے نہ چھونے دیا۔ فرق ہی کیا پڑتا تھا۔ وہ تھا ہی فرزند۔ اپنے باپ پر گیا تھا۔

فروان کے ہجروں کی بیڑی نہ بن سکا۔ امی جانی اُسے اپنے ساتھ رامپور لے گئیں۔ سچ پوچھیے تو وہ ان کا ہی بیٹا لگتا تھا۔ اتنی سی عمر میں ماں بن گئی تھیں مگر یہ کردار اُن پر قطعی نہ سجتا تھا۔ انہیں اُس سے امّاں کہلواتے بھی عجیب سا لگتا اور جب وہ شہنو کہتا تو بیٹے کے منہ سے اپنا پیار کا نام سن کر انہیں اُس پر کچھ کچھ پیار آنے لگا تھا۔

یہ وہی زمانہ تھا جب تک نیند اُن سے نہیں روٹھی تھی۔ اسی ہرجائی نیند نے ایک دن رقص کے بیچ میں اُن کی بدمست انکھڑیوں میں سما کر انہیں ان کے پارٹنر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ وہی مضبوط بانہوں والا پارٹنر تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ وہ انہیں باہر گھاس پر لٹانے گیا تھا۔ ویسے اُس کی نیت کچھ زیادہ بد نہ تھی۔ مگر اتنی سی بات پر سلمان صاحب جذباتی ہو گئے۔ ورنہ وہ اُن کے پارٹنر کا جبڑا توڑ بیٹھتے۔ وہ اتفاق سے اُن کا افسرِ اعلیٰ بھی تو تھا۔ اگر ایک افسرِ اعلیٰ از رہِ کرم اپنے ماتحت کی بیوی کو جو رقص کے درمیان لمبی تان لینے پر مصر ہو۔ . . . . . گھاس پر لٹا رہا ہو تو وہ جبڑا اکھڑوانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ ہر ایک جانتا ہے کہ کسی کو گھاس پر لٹانے میں کیسے کیسے آسن مارنا ہی پڑتے ہیں۔ اگر سلمان نے اتنے چھچھورپن سے اپنی حماقت کا اس قدر شاندار ثبوت نہ دیا ہوتا تو شاید بات آگے نہ بڑھتی اور انہیں باس کی ضرورت سے زیادہ دلجوئی نہ کرنی پڑتی۔

باس یعنی مسٹر دین قوی ہیکل تو تھے مگر قطعی گوریلے کی طرح حسین تھے۔ کالے بھجنگ بالکل چھوکھوٹے تمباکو کے پنڈے کی شکل کے۔ ان کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ انسان کے آبا و اجداد بندر تو تھے مگر ان کا گینڈے سے بھی کوئی ناطہ رہا ہوگا۔ بڑے بڑے کان ـــــ سلمان سے قد میں ایک دو انچ کم ہی ہوں گے۔ مگر چوڑان میں دو ڈھائی گنا۔

شہنانہ کو بدصورتی سے ہمیشہ گھن آتی تھی۔ مگر یہ کالا دیو بنز پیک کو نہ جانے کیوں

بھا گیا تھا۔ ویسے شہنانہ کے خرچے زیادہ، آمدنی کم تو ہمیشہ سے تھی۔ فلیٹ بھی مسٹر دین کی عنایتوں کی بدولت مل گیا تھا۔ سوسائٹی میں ساکھ قائم رکھنے کے لئے دعوتیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ کپڑے لتّے کی ضرورت بھی ہوتی تھی۔ پینے پلانے میں بھی خاصا خرچ آجاتا تھا۔ اُن کے پاس زیادہ تر جہیز کی ساڑیاں تھیں یا اماں جانی بھیجتی رہتی تھیں۔ مگر عموماً اپ ٹو ڈیٹ نہ ہوتی تھیں۔ دوسرے مسٹر دین میں نہ جانے کونسا جادو تھا کہ وہ اُن کے ہاتھوں میں موم کی طرح پگھل جاتی تھیں۔ انہیں پیار کرنے کے طریقے آتے تھے۔

اس کے علاوہ اس معاملے کو بڑھاتے چڑھانے میں کچھ سلمان کا بھی ہاتھ تھا۔ اُن کی عاشق مزاجیاں اپنی جگہ کچھ کم نہ تھیں۔ حلیمہ دین اُن کی کلاس فیلو رہ چکی تھیں۔ انہیں کی سفارش سے اتنی مرتبے دار نوکری ملی ہوئی تھی۔ جس میں دعوتیں اور پکنکیں زیادہ اور کام بالکل نہیں کے برابر۔

جب فرید ہونے والا تھا تو سلمان صاحب اپنے باس کی بیگم کی تنہائیاں دور کیا کرتے تھے کیونکہ دین صاحب یورپ کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ اس لئے انہیں فرید سے پہلے ہی چڑ ہو گئی تھی اور اُن کی ممتا جاگ نہ سکی۔ اگر وہ پیٹ میں نہ ہوتا تو حلیمہ دین سلمان کو ہل اسٹیشن نہ لے جا پاتیں۔ اچھی طرح سے زچہ خانہ کی زردی بھی نہیں مٹی تھی کہ سلمان انہیں امّی جان کے سپرد کر کے خود اپنے باس کی گرگی سے اُکتائی بیگم کو لے کر پہاڑ پر چلے گئے۔

"ڈارلنگ، یہ سب نوکری کی خاطر کرنا پڑ رہا ہے۔" انھوں نے سمجھایا تھا۔ مگر اُن کی سمجھ میں نہیں آیا تھا اور انتقاماً مسٹر دین کے آنے کے بعد وہ اُن کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ امّی جان کو ہمیشہ سے سلمان سے چڑ آتی تھی ایک تو اُن کی تنخواہ شہنانہ جیسی

لڑکی کے اسٹینڈرڈ کی نہ تھی۔ دوسرے کہتے تھے کہ شہنو کو اس پھٹ پڑنی سے ماں بنا ڈالا۔ کہ بچی کو ذرا بھی کھیلنے کھانے کا موقع نہ ملا۔ سے دے کر اُن کی ایک ہی تو اولاد تھی مگر وہ بھی اتنی بدھو کہ سلمان کی خالی خولی چاپلوسی میں آکر راجوں اور مہاراجوں کے پیغامات ٹھکرا دیئے۔ اشاروں کنایوں میں انھوں نے شہنانہ کو قائل کر دیا کہ حلیمہ اور دین کی دلچسپی بھی نہیں

qasarulkutub.blogspot.com

بنتی۔ بہترین موقع ہے۔ اگر بات بن جائے تو دلدّر دور ہو سکتے ہیں۔ اس لئے جان بوجھ کر وہ فرد کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ آہ! فرد ـــ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اُس کی لمبی ٹانگیں بھی اس سوئے ہوئے توجی کی طرح قطعی مسہری سے باہر نکل آتیں۔ مگر فرد کی ٹانگوں کے نصیب میں مسہریاں کہاں، برما کے جنگلوں کی دلدل تھی۔

مگر شبانہ کی پیدائش پر ایک دم اُس کی ماتا جاگ گئی۔ اس سے اُنھیں قطعی کوفت نہ ہوئی۔ حالانکہ فرید کے مقابلہ میں وہ نہایت کھونڈی اور بدوضع تھی۔ مسٹر دین کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ اتی جانی کا خیال تھا اگر بیٹا ہوتا تو شاید وہ پگھل جاتے۔ مگر وہ تو دولت بنانے میں ایسے مشغول تھے کہ اُنھیں کسی سے شدید محبت کرنے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ شہناز نے بہت چاہا تھا کہ وہ اپنی بیگم کو طلاق دے کر اُن سے شادی کر لیں مگر وہ اس اسکینڈل کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اُن کی بیوی اُن کے بزنس میں نصف کی ساجھے دار تھیں۔ سارا روپیہ بھی اُن کے قبضے میں تھا۔ ویسے دونوں کی اب بھی بڑی سُلجھی ہوئی دوستی قائم تھی۔ ایک کو دوسرے کے نجی معاملات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ سوسائٹی میں وہ اب بھی میاں بیوی کی حیثیت سے ایک باوقار مقام رکھتے تھے۔ سرکاری و نیم سرکاری دعوتوں میں وہ کبھی شہناز کو نہیں لے گئے۔ وہ اُن کا نجی معاملہ تھا اور نجی معاملہ ہی رہا۔ سلمان کو تو اعتراض نہ تھا۔ مگر اُنھوں نے خود ہی شبانہ کا بار اُن کے کندھوں پہ نہ ڈالا۔

اور نہ وہ اُسے اپنی نظروں سے دور رکھ سکیں۔ اُنھوں نے اُس کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کی نرس مقرر کر دی تھی اور اُسے ایک شاندار ہوٹل میں رکھتی تھیں جس کا خرچہ بڑی دریا دلی سے دین برداشت کرتے تھے۔ اور جب وہ سب سے چھُپ چھپا کر چوروں کی طرح اپنے کلیجے کی ٹکڑی کو سینے سے لگانے ہوٹل جاتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کسی سنسنی خیز ناول کی بدنصیب مگر رومینٹک ہیروئن ہیں۔ وہ اُسے گود میں لے کر روتیں۔ عام طور پہ اس دردناک سانحہ کی خبر دین تک پہنچ جاتی اور وہ اشک شوئی کے لئے ساڑھیوں کے بنڈل بھجوا دیتے۔ مگر ان کے آنسو پھر بھی نہ تھمتے۔ آہ، ظالم سماج نے اُنھیں اپنی بچّی سے جدا کر رکھا تھا۔ وہ اپنی لاڈلی کو اعلانیہ چوم بھی تو نہیں سکتی تھیں۔ اُنھوں نے اُس کے گرد ایک دردناک المیہ تیار کر لیا تھا۔ جس کی ہیروئن بن کر وہ خود کو نہایت

رومینٹک نظر آتیں۔

مگر اُن میں درمیانہ درجہ کی بہت سی کوتاہیاں باقی تھیں۔ مسٹر اور مسز دین کی طرح وہ اپنے شوہر سے پُرخلوص تعلقات نہ قائم کر پائیں اور نہ وہ حلیمہ دین سے خندہ پیشانی سے پیش آ سکیں۔ جب بھی یہ دونوں جوڑے کسی پینے پلانے کی محفل میں اکٹھے ہو جاتے دو چار ہی پیگ کے بعد جلی کٹی باتیں شروع ہو جاتیں۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی بھیانک بات نہ تھی۔ عورتیں جیسے دوپٹہ بدل کر ایک دوسرے کی بہن بن جاتی ہیں اسی طرح حلیمہ اور شہناز شوہر بدل بہنیں تھیں۔ شریف بیویاں ایسے موقعوں پر ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو کر اچھی بھلی فضا کو مکدّر نہیں کیا کرتیں۔ پھر ایک دن حالات نے قلابازی کھائی، مسٹر دین اور مسز دین میں ایک دم ملاپ ہو گیا۔ اور وہ انگلستان روانہ ہو گئے۔

بعد میں معلوم ہوا کہ اُنھوں نے اپنا بزنس ایک سندھی کے ہاتھ بیچ دیا جس کا اکاؤنٹ انگلستان میں تھا۔ کچھ الٹ پلٹ کے بعد دین فیملی نے ہجرت ہی میں بہتری سمجھی، نئے باس نے مسٹر سلمان کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔ اور پلک جھپکاتے میں شہناز اور اُن کے شوہر پتھریلی۔ بنجر زمین پر ایڑیاں رگڑتے نظر آئے۔

کیا قیامت کا وقت تھا۔ چھ مہینے کا فلیٹ کا کرایہ نہیں دیا تھا۔ دوست احباب سب مسٹر دین کی دی ہوئی نوکری سے بنے تھے، وقت بگڑا تو وہ بھی پھُر سے غائب ہو گئے۔ اس وقت اگر مسز دوراب جی نے، جو اپنے مرحوم شوہر کی شراب کی دکان کو بڑی مستعدی سے چلا رہی تھیں اگر ڈوبتی ناؤ کو اپنی دولت کے چھینٹوں سے سہارا نہ دیا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ مالا بار ہل پر اُن کا شاندار فلیٹ تھا۔ اُس پر کچھ پولیس کو اعتراض ہونے لگا۔ وہ فلیٹ اُنھوں نے پگڑی پر دے دیا اور خود شہناز کے فلیٹ میں ایک کمرہ لے کر رہنے لگیں۔ اُنھوں نے حالات کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد چھ مہینے کا کرایہ ادا کر دیا۔ ایک کمرہ چھوڑ کر سارے فلیٹ پر قبضہ ہو گیا۔ اس عرصے میں سلمان کے زخمی دل پر خورشید سنہا نے مرہم رکھنا شروع کر دیا تھا۔ سنہا ہوائی جہاز کے حادثے میں جانباز پائلٹ کی موت مر کر اپنی غمگین بیوہ کے لئے اچھی خاصی پنشن کا انتظام کر گیا تھا۔ مسز دوراب جی نے ایک کمرہ فلیٹ میں اُسے دے رکھا تھا۔ کچھ دن یہ انوکھی خاندان

qasarulkutub.blogspot.com

بچے سے محروم رہا۔ سلمان اور خورشید کی جوڑی بن گئی۔ مسز دوراب جی شہناز کو بڑی دلچسپ ہستیوں سے متعارف کرانے لگیں۔ کبھی افسران کے غول بوتلوں کے بکس لے کر آجاتے۔ کبھی جہازی قہقہے لگانے والے موجود ہوتے۔ بعض کے ساتھ خواتین بھی ہوتیں کچھ کو مسز دوراب جی کی سہیلیاں سنبھال لیتیں۔ خوب قہقہے چلتے۔ ریکارڈ لگا کر ڈانس کیے جاتے۔ چوما چاٹی سے آگے بات نہ بڑھتی۔ یہ اور بات تھی کہ کبھی کوئی جوڑا اُٹھ کر تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو جاتا۔

اور یوں دن گزرتے رہے ——— زندگی چلتی رہی۔ خورشید اور سلمان کی بڑی جانی پہچانی سی دوستی تھی۔ اگر وہ شادی کر لیتی تو پنشن بند ہو جاتی جو خاصی معقول تھی۔ اور سلمان کھرا عشق کرنا جانتے تھے، گرہست بنانا اُن پر ظلم کرنا تھا جب سے نوکری چھوٹی تھی خورشید ہی اُن کا خرچ اُٹھا رہی تھی۔

یہ خورشید کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا شوہر اس کے لئے پنشن کا انتظام کر کے مرا تھا۔ مگر شہناز کا تو کوئی سہارا نہ تھا۔ امی جان نے فرد کو لائق فائق بنا دیا تھا۔ شاہانہ کا ہوٹل کا خرچہ اب قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ المیہ بھی کچھ باسی ہو چکا تھا اس لئے اُنھوں نے اُسے امی جانی کے سپرد کر دیا تھا۔ کچھ رقم جو شروع میں چلتے چلتے اُنھیں تھما گئے تھے وہ تنہائی اور وحشتِ دل دور کرنے کے سلسلے میں ختم ہو گئی۔ کچھ مسز دوراب جی کی شراب کی بوتلوں میں گئی۔ کچھ ریس کورس پر ڈوبی۔ بمبئی جیسے شہر میں چند ہزار کی حیثیت ہی کیا؟

یہ وہ زمانہ تھا جب فرد کی اچانک موت نے اُنھیں اوندھے منہ گرا دیا تھا۔ نہ جانے اتنے دن کی سوئی ماتا کیوں ایک جھٹکے سے جاگ اُٹھی۔ فرد کے رخصت ہوتے وقت وہ ایلورا، اجنتا کا فن ملاحظہ کرنے اپنے دوستوں کے ساتھ گئی ہوئی تھیں۔ جدائی کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ مگر موت نے اُنھیں کچل کر رکھ دیا۔ مہینوں وہ گم رہیں۔ اگر ایک لمحہ کو بھی اُنھیں ہوش آجاتا تو پاگل ہونے لگتیں۔

فرد کے خیال پر وہ ایک دم ماضی کی دم گھونٹنے والی فضا سے لوٹ آئیں۔ پہلو میں پڑے ہوئے نوجوان نے ایک لمبی چوڑی کروٹ لی۔ اور چاروں ہاتھ پیر پھینک کر پھیل گیا۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی کچھ اور دودھیا ہو گئی تھی۔ اُس کا سڈول جسم ساری مسہری پر قابض تھا۔

"شہنو ڈارلنگ ——— مائی سوئٹ بے بی ———" اُس نے اُن کے کان کی لو چباتے

ہوئے اُن سے شادی کی درخواست کی تھی۔ اُس کے گھولتے ہوئے الفاظ سانپ کی پھنکار کی طرح اب تک اُن کے کانوں میں رینگ رہے تھے۔

شادی!

ایک ایک کر کے نہ جانے کتنے برسوں کا بوجھ اُن کے کاندھوں سے سرک گیا تھا۔ اُنھوں نے سسکی بھر کر خود کو اُس کی کڑیل بانہوں میں بے سُدھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت تھک گئی تھیں۔ اگر کچھ دن اور نیند نہ آئی تو اُن کی ہستی بارود کے ڈھیر کی طرح بھک سے اُڑ جائے گی۔ کتنی وسعت تھی نوجوان کے چوڑے سینے میں! اُس کی تازگی کے سائے میں اُن کی خشک ہستی لہلہا اُٹھے گی۔ اُنھوں نے تھکے ہارے مسافر کی طرح نڈھال ہو کر اپنا منہ اُس کے چیٹل سینے پر ٹکا دیا۔ اور ننھی سی یتیم بچی کی طرح سسکنے لگیں۔ فوجی جوان نے سوتے میں جیسے کتّے کو پچکارا۔

"بے بی ایے بی ——— پچ ——— مائی سوئٹ بے بی ڈارلنگ!"

وہ پھر بڑبڑایا اور دوسرے لمحے خوابوں کی دُنیا میں چوکڑیاں بھرنے لگا۔

اُن کی کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ آنکھوں میں بھوبل کھٹک رہی تھی دل ایک پنچھی کی طرح پھڑک رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے اُس کے جسم پر ہاتھ پھیرتی رہیں اور آنسو بہاتی رہیں۔

وہ اس ہنگامے کی تنہائی سے گھبرا چکی تھیں۔ فلیٹ قہقہوں سے گونجا کرتا مگر اُن کے دل کی ویرانی اور بڑھتی جاتی۔ مسز دوراب جی نہ جانے کہاں سے مغربی سیاحوں کے غول کو گھیر لاتیں۔ جب سے شراب بندی کا قانون نافذ ہوا تب سے فلیٹ ایک نہایت شائستہ قسم کا قحبہ خانہ بن گیا تھا جہاں گاہک بطور دوستوں کے آتے۔ پرمٹ کی شراب تو پہلے ہی حملے میں ختم ہو جاتی۔ پھر مسز دوراب جی کی بوتلیں کھلتیں اور دادِ عیش دی جاتی۔

کئی بار اُنھوں نے اُکتا کر شادی کرنی چاہی۔ ایک جان چھوڑ ہزار جان سے عاشق ہوئیں۔ اپنا تن من دھن سب لٹا دیا۔ مگر شکار ہمیشہ رسیاں تڑا کر بھاگ نکلا۔ اور جب کوئی یوں اُنھیں جُل دے کر نکل جایا کرتا تو اُن پر پھر دورے پڑنے لگتے ——— پرانی ہسٹیریا عود کر آتی۔ خون کا دباؤ گر جاتا اور وہ ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنے کے لئے شراب کا سہارا لیتیں۔ ایسے موقعوں پر مسز دوراب جی اُن پر خوب پھبتیاں کستیں۔ ایک

دفعہ تو اُس نے اُنھیں اتنا سلگایا کہ جوتی لے کر اُنھوں نے اُس کا پلیتھن نکال دیا۔ وہ بھی غصے میں آ کر چلی گئی۔ اُس کے جاتے ہی شہناز میں ایک عظیم الشان انقلاب واقع ہُوا۔

اُن کی ملاقات ایک جبروت قسم کے انقلابی شاعر سے ہو گئی۔ اور وہ بڑے شد و مد سے ملک میں انقلاب لانے پہ تل گئیں۔ جلا م نگی کی ماں کی حیثیت سے وہ خود کو بے انتہا انقلابی سمجھتی تھیں۔ آرٹ اور کلچر کی خدمت کے سلسلے میں اُنھیں فرداً فرداً کئی فنکاروں پہ عاشق ہونے کا موقع ملا۔ مسز دین کی عکاسی ہوتی ساڑھیاں بالکل بے کار ہو گئیں۔ اُن دنوں اُنھوں نے نہایت باغیانہ اور میلی ساڑھیاں پہن کر واقعی مزدوروں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس ماحول میں نہ تو انگریزی شراب کچھ سجتی اور نہ آسانی سے مہیا کی جا سکتی تھی۔

لہٰذا اُنھوں نے نہایت سستی دارو پر دست شفقت پھیرنا شروع کر دیا۔

اُف کیا ہنگامہ خیز دن تھے وہ بھی! میلے میلے فن کاروں سے اُن کا فلیٹ کھچا کھچ بھرا ہوتا۔ سستے ٹھرے کی بو سے فضا بس جاتی —— تب علم و ادب فلسفہ اور شاعریہ مباحثے ہوتے جو عموماً جوتم پیزار پر ختم ہوتے۔

مگر جلد ہی اُنھیں قائل ہونا پڑا کہ ننگے بھوکے فن کاروں کی صحبت میں روحانی غذا کی فراوانی تو ہو سکتی ہے مگر مکان کا کرایہ اور گھر کا خرچ چاہے اگر اُن کی کھال بھی اُتار لی جائے۔ تو بھی نہیں چل سکتا۔ مجبوراً اُنھوں نے پھر مسز دوراب جی سے میل کر لیا۔ وہ شاید منتظر ہی بیٹھی تھی۔ فوراً راضی خوشی من گئی۔ اُس نے اُجڑے ہوئے فلیٹ کو دوبارہ سنوارا۔ اور پھر وہی صوفی قسم کے دوست اور ولایتی شرابیں چلنے لگیں۔ سیاحوں کے جمگھٹے رہنے لگے۔

اور یہ شمالی ہند کا گیرڈ اسی سلسلے کی کڑی تھا۔

آنسوؤں کی چلمن میں سے اُنھوں نے نیند کے ماتے جوان کو دیکھا۔ اُس کی ناک اور اوپر کے ہونٹ پر ننھی ننھی پسینے کی بوندیں ہیرے کی کنیوں کی طرح دمک رہی تھیں۔ اُنھوں نے جھک کر اپنے سرد اور باسی ہونٹ اُس کے دہانے کے کونے پر رکھ دیئے۔ جہاں جاگتے میں ایک ننھا سا گڑھا مسکرانے لگتا تھا۔

پو پھٹنے لگتی تھی —— کوئی دم میں سورج کی بے رحم سلاخیں ان سوئی ہوئی انکھڑیوں میں چبھنے لگیں گی اور فوجی جوان جاگ پڑے گا۔ اُنھوں نے ایک بار جی بھر کے

لاڈلے کو دیکھا۔ اور اُس پہ چادر ڈال دی۔

ایک لمحہ کو پلک جھپکائے بغیر وہ تھکے ہوئے جسم کو گھسیٹ کر بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

آئینے میں وہ اپنے چہرے کے ویران کھنڈروں کو دیکھ کر لرز اُٹھیں۔ اُس کے جاگنے سے پہلے مرمت کرنا ہوگی۔ وہ دبے پیر کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ جاگ رہا تھا۔ اُنھیں دیکھ کر اُس نے انگڑائی بیچ میں توڑ دی اور گھبرا کر چادر اپنے گرد سمیٹ لی۔ اور اپنی جھینپی ہوئی مسکراہٹ کو سگریٹ کے دھوئیں کے پیچھے چھپانے لگا۔

"بے بی ——" اُس نے ہکلا کر کہا اور وہ پتھر کا بت بن کر ٹھٹک گئیں۔

"بے بی کہاں ہے؟" اُس نے سگریٹ کے سلگتے ہوئے سرے پر نظریں جما کر پوچھا۔

"بے بی ——؟" آواز اُن کے گلے میں سہم کر رہ گئی۔

"ہاں ——" وہ غور سے اُنھیں پہچان کر بولا —— "وہ آپ کی بیٹی ہے نا؟ کتنی شکل ملتی ہے آپ دونوں کی!" وہ انگریزی میں بولا۔

"کیا بک رہے ہو؟" اُنھوں نے غرور سے تن کر کہا۔

"میں اتنا کمینہ نہیں ہوں میڈم۔ ہم شادی کر لیں گے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے تکنے لگیں۔ پھر جلدی سے میک اپ کا بیگ اٹھا کر دونوں ہاتھوں سے بھینچے لوٹ آئیں۔

اُنھوں نے ایک بار پھر اپنی شکل آئینے میں دیکھی اور اس سنسان کھنڈر کے پیچھے کمسن حسینہ کو ڈھونڈھنے لگیں۔ جسے نیم تاریک کمرے کی دھواں بھری فضا اور شراب کے نشے نے اُس نوجوان کی بہکی ہوئی آنکھوں میں ایک شام کے لئے جنم دے کر صبح کو سورج کی ظالم کرنوں نے چھلنی کر دیا تھا —— وہ خوابوں کی شہزادی اُن سے بہت قریب اور کھنڈر میں دفن، ابدی نیند سو رہی تھی۔ اُنھوں نے میک اپ کا بیگ دور کونے میں پھینک دیا اور آنسوؤں سے چھلکتے قہقہے لگانے لگیں۔

ناشتے پر سوچی سوچی غلافی آنکھوں والا نوجوان بڑی بے چینی سے بے بی کے قدموں کی چاپ سننے کے لئے بے قرار تھا۔ بار بار وہ اُن کے نقوش میں اس کھوئے

desurdukutub.blogspot.com

ہوئے خواب کو ڈھونڈھ پاتا اور خود ہی جھینپنے لگتا۔

"جانے سے پہلے صرف چند منٹ کے لئے میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں"۔ اس کے لہجے کی مٹھاس اُن کے کلیجے میں رس گھول گئی۔ اُنھیں اُس کی لجاجت پر پیار آگیا۔

"تم اُس سے نہیں مل سکتے"۔ اُنھوں نے بڑی مشکل سے جذبات سے بھرپور آواز میں کہا۔

"کیوں؟ ــــ مگر ــــ میں اُن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"پلیز ــــ ناشتہ ختم کیجئے اور تشریف لے جائیے۔" اُنھیں غصّہ آنے لگا۔

جیسے واقعی اُس نے اُن کی معصوم بیٹی کو خراب کر دیا ہو۔

اُس نے ناشتہ نہیں کیا۔ سر پکڑے خالی ڈش پلیٹ پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔

"تھوڑی سی وسکی مل سکے گی؟" اُس نے دونوں ہتھیلیوں سے کنپٹیاں دبائیں۔

"نہیں ــــ" وہ بڑی درشتگی سے بولیں۔

جاتے وقت اُس نے بڑی رقّت بھری آواز میں التجا کی۔

"بے بی سے کہنا میرا انتظار کرے۔ دورے سے واپس لوٹتے وقت میں پھر آؤں گا ــــ شادی کے بعد میں اُسے لدھیانہ لے جاؤں گا ــــ" اُس نے احمقوں کی طرح آنکھیں جھپکا کر آنسو پی لئے۔

جب وہ چلا گیا تو وہ دیر تک افق کے اُس پار بے بی کو نوجوان کی مضبوط باہوں میں سوتا ہوا دیکھتی رہیں۔ بمبئی کے ہنگاموں سے دور ــــ اس مہذب قحبہ خانہ اور مسز دوراب جی کے چنگل سے آزاد ــــ نت نئے سیّاحوں کی گرفت سے باہر ــــ کھلے کھیتوں کی مہکتی ہوئی شبنم میں نہائی ہوئی کچی پکّی دھرتی کی گود میں ــــ دو نینوں کے متوالے جوان جسم گیندے اور چنبیلی کے گوندھے ہوئے دو تر و تازہ گجروں کی طرح ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے ــــ اُن کی بے رونق آنکھوں میں گُھٹے ہوئے آنسوؤں کی طرح ٹھٹکتے رہے اور نیند اُن کی بوڑھی آنکھوں میں زہر گھول کر نہ جانے کہاں جا سوئی تھی!

کنواری

اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے وہ اتنی بہت سی سیڑھیاں ایک ہی سانس میں چڑھ آئی تھی۔ آتے ہی وہ بے سُدھ پلنگ پر گر پڑی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔

میں خود خاموش رہنے کے موڈ میں تھی۔ مگر اُس کی حالت دیکھ کر مجھے پریشان ہونا پڑا۔ اُس کا رنگ بے حد میلا اور زرد ہو رہا تھا۔ کھلی کھلی بے نور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور بھی گہرے ہو گئے تھے۔ منہ پر میک اپ نہ تھا۔ خاص طور پر لپ اسٹک نہ ہونے کی وجہ سے وہ بیمار اور بوڑھی لگ رہی تھی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے بتائے ہوئے ڈاکٹر کا علاج تسلی بخش ثابت ہوا۔ اُس کا پیٹ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور سینہ سپاٹ ہو گیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس قتل میں میں بھی کچھ ذمہ دار ہوں۔ مگر میں ڈاکٹر کا پتا نہ بتاتی تو کوئی اور بتا دیتا۔ بن بُلائے مہمان کو ایک دن نکالا تو ملنا ہی تھا۔

"ایک مشورہ لینے آئی ہوں ــــ" سانس قابو میں آتے ہی اُس نے کہا۔

"جمعہ جمعہ آٹھ دن بیتے نہیں اور مُردار کو پھر مشوروں کی ضرورت آن پڑی ہے۔"

qasarulkutub.blogspot.com

میں نے چڑ کر سوچا، مگر نہایت خندہ پیشانی سے کہا۔

"تو ضرور لو۔ آج کل بہت مشورے میرے دماغ میں بجبجا رہے ہیں۔"

"آپا، میں شادی کر لوں۔" اُس نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔ گویا اگر میں نے اجازت نہ دی تو وہ کنواری ارمان بھری مر جائے گی۔

"مگر تمہارا شوہر؟"

"موت آئے حرامی پلّے کو۔ اُسے کیا خبر ہوگی۔"

"یہ بھی ٹھیک کہتی ہو۔ بھلا تمہارے شوہر کو تمہاری شادی کی کیا خبر ہوگی۔" میں نے سوچا۔ "مگر تمہاری شادی کے چرچے اخباروں میں ہوں گے۔ آخر اتنی بڑی فلم سٹار ہو۔"

"فلم اسٹار کی دُم میں ٹھینگا۔" اللہ گواہ ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ گالی ہوتی کہ نہیں۔ مدن ایک سانس میں تین گالیاں بکنے کی عادی ہے۔ مجھے تو اُس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ گالی جیسا سُنائی دیتا ہے۔ مگر حقیقت ہے کہ سوائے چند عام فہم گالیوں کے یہ گُل کاریاں میرے پلّے نہیں پڑتیں۔

"بھئی ایک بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی۔" میں نے بات کی لگام ایک دم دوسری سڑک پر موڑ دی۔ "تم شادی شدہ ہو تو تمہارا بچّہ حرامی کیسے ہوا؟"

"اوہ آپا۔ اللہ کا واسطہ، کبھی تو سمجھا کرو۔ کمبخت شادی تو شبّو دو سال کا تھا تب ہوئی تھی۔"

"شبّو کے باپ ہی سے نا۔" میں نے سہم کر پوچھا۔

"اونہوں، تمہیں یاد تو کچھ رہتا نہیں۔ بتایا تو تھا ــــ وہ کمبخت ــــ"

"اچھا! ــــ یاد آگیا ــــ وہ تمہیں گرہستی کا شوق چرّایا تھا۔" میں نے اپنی کند ذہنی پر شرمندہ ہو کر کہا۔

"بھوسا چرّایا تھا۔ ماں کے خصم نے دھندا کرانا شروع کر دیا۔" پتا نہیں ماں کا خصم رشتے میں کیا ہوا؟

"اونہہ، چھوڑو اس نامراد شادی کا تذکرہ۔ نئی شادی کا ذکر کرو۔ اللہ رکھے کب کر رہی ہو۔ کون ہے وہ خوش نصیب؟"

"سُندر!" اور وہ قہقہہ مار کر قالین پر لوٹ گئی۔

ایک ہی سانس میں اُس نے سب کچھ بتا ڈالا۔ کب عشق ہوا۔ کیسے ہوا۔ اب کن مدارج سے گزر رہا ہے۔ سندر اس کا کس بُری طرح دیوانہ ہو چکا ہے۔ کسی فلم میں کسی دوسرے ہیرو کے ساتھ لو سین (Love Scene) نہیں کرنے دیتا اور وہ خود بھی اُسے کسی دوسری ہیروئن کے ساتھ رنگ رلیاں نہیں منانے دیتی۔

"آپا، یہ فلم والیاں بڑی چھنال ہوتی ہیں۔ ہر ایک سے لنگر لڑاتے لگتی ہیں۔" اس نے ایسے بھولپن سے کہا جیسے وہ خود بڑی پارسا ہے ــ "آپا، کوئی چیٹ پٹی سی کہانی لکھو۔ ہم دونوں اس میں مفت کام کریں گے۔ مزا آجائے گا۔" اُس نے چٹخارا لیا۔

"سنسر سب کاٹ دے گا۔"

"سنسر کی . . . . ." اُس نے موٹی سی گالی سنسر کی قینچی پر داغی۔ "شادی کے بعد کام تھوڑی کروں گی۔ سندر کہتا ہے اپنی دُلہن کو کام نہیں کرواؤں گا۔ چمبور میں بنگلہ لے لیں گے۔" خوابوں کے جھولے میں پینگ لیتے ہوئے کہا اور ایک دفعہ تو مجھے بھی یقین ہو گیا کہ اس کی دُنیا بس جائے گی۔ چمبور بنگلے میں وہ بیگم بنی بیٹھی ہوگی بچے اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوں گے۔

"امّاں کھانا۔ امّاں کھانا۔" وہ چلّائیں گے۔

"اے ہے ذرا صبر کرو ــــ آلو تو گل جانے دو۔" وہ کفگیر سے اُنھیں مارے گی۔

تب بچّوں کا باپ مسکرائے گا۔ "بیگم کیوں مارتی ہو۔ ابھی بچّے ہیں۔"

"بس ایک لونڈا ہو جائے پھر سالے کو شادی کرنی پڑے گی۔"

"تو کیا ابھی شادی نہیں ہوئی؟" خوابوں کی کشتی سے لوٹ کر میں نے پوچھا۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ جیسے میری اپنی کنواری کی بارات دروازے سے لوٹ گئی۔

"نہیں آپا۔ حرامزادہ ہے بڑا چالاک۔ نہ جانے کیا کہتا ہے۔" وہ دیر تک سُندر کو پھانسنے کی ترکیبیں پوچھتی رہی۔ نہ جانے کیوں یہ بات اُس کے دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اگر بچّہ ہو گیا تو سُندر کے پیر میں بیڑیاں پڑ جائیں گی۔

daarulkutub.blogspot.com

"اور پھر بھی اُس نے شادی نہ کی تو؟"

"کرے گا کیسے نہیں اُس کا تو باپ بھی کرے گا۔"

"خیر باپ کا ذکر فضول ہے۔ وہ مر بھی چکا۔"

"حرامزادے کی چھاتی پہ چڑھ کر خون نہ پی جاؤں گی۔"

"شنتو کے باپ کی چھاتی پہ چڑھ کر کیوں نہ خون پی گئیں؟"

"جب میری عمر ہی کیا تھی۔ اتنی چوری ان کے پلے پڑ گئی۔ بس تم کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کر سانے کی ایک نہ چلے اور . . . " پھر کہیں وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی اُن سے مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی۔

مدن کئی بار سندر کو لے کر میرے ہاں آئی۔ سندر اپنے نام کی طرح حسین اور نوعمر تھا، مدن سے کسی طرح بڑا نہ معلوم ہوتا تھا۔ نیا نیا کالج سے آیا تو بھولے بنگالی کی طرح جو کیسے عشق لڑاتے شروع کر دیئے۔ اسی چھین جھپٹ میں مدن اسے اُڑا لائی۔ اچھے گھرانے کا قہقہہ باز اور باتونی لڑکا پہلی ہی دفعہ گھر میں ایسا بے تکلف ہو گیا جیسے برسوں سے آتا جاتا ہے۔

اُسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ کیوں مدن اُسے دل دے بیٹھی۔ اُس کی صحبت میں ایک لمحہ بھی اُداس نہیں گزرتا تھا۔ مدن جیسی پٹی پٹائی غم نصیب لڑکی کے لئے ذرا سی نرمی بھی چھلکا دینے کو کافی تھی۔ وہ سندر کے ہر جملے پر بے تحاشہ قہقہے لگاتی۔ وہ بات پہ نہیں، اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ پر لبوں کی جنبش پہ مسحور ہو کر کھلکھلا پڑتی۔ مسرت کی اچھلتی کودتی موجیں اُسے جھکولے ڈالتیں۔ سندر کے لب ہلنے اور وہ قہقہہ مارتی، پانی پیتی ہوتی تو اُچھو لگ جاتا، کھانا کھاتی ہوتی تو منہ کا نوالہ سامنے بیٹھنے والے کے اوپر چھڑک دیتی۔

وہ دونوں نہ جانے اپنا گھر چھوڑ کر میرے ہی ہاں ٹھمیں کرنے کیوں آتے تھے، بچوں جیسی شرارتیں کرتے، قلا بازیاں کرتے۔ کبھی روٹھتے، کبھی منتے۔ انہیں دیکھ کر مجھے بکری کے وہ کھلنڈرے بچے یاد آ جاتے جو ہرے کھیت میں پھدکتے آ جاتے ہیں۔ دندناتا ہوا عشق تھا دونوں کا، بے پروں کے ہوا میں اُڑے جاتے تھے۔

جنگلی ہرنیوں جیسے چوکڑیاں بھرتے ہوئے پیار نے مدن کی کایا پلٹ کر دی۔ وہ ایک دم بے حد حسین اور جاذب نظر بن گئی۔ جلد کے نیچے دیئے روشن ہو گئے۔ سوئی ہوئی آنکھیں جاگ اُٹھیں، ہزاروں جادو سرگوشیاں کرنے لگے۔ سپاٹ سینہ کھل اُٹھا کر طبلے لہرانے لگے۔ سندر سے کشتیاں لڑ لڑ کر وہ پھر پتلی بن گئی۔

سندر کی اور مدن کی جوڑی بن گئی، جن فلموں میں وہ سندر کے ساتھ نہ تھی انہیں ڈفرانا شروع کر دیا۔ سیٹ سے بڑے معرکے کے سین میک اپ روم میں ہونے لگے۔ وہ فلمیں جو آدھی ہو گئی تھیں، چیتھڑا ہو گئیں، مدن نے پہلی بار کسی نوجوان کو دل دیا تھا۔ سب کچھ بھول کر وہ اُسی میں ڈوب گئی۔

سندر اُس کے بڑے لاڈ سہتا۔ اُس کے پھوہڑپن پہ ہنستا۔ اُس کے اُجڑے ہوئے گھر میں جا کر جان ڈال دیتا۔ نانی کو اماں اماں کہہ کر مسکا لگاتا۔ خالہ سے بیٹھ کر غیبتیں بانٹتا۔ بھائی کو وسکی پلاتا۔ بچوں کے ساتھ دھما چوکڑی مچاتا۔ اُسے مدن کے جسم سے مطلب تھا۔ اُس کی آمدنی اسی طرح منہ بولے رشتہ داروں کے تنور میں جھونکی جاتی تھی۔ شنتو کو بہت پیار کرتا۔ مدن نے اُس بدنصیب بچہ کا حال اُسے سنا دیا تھا۔ وہ بیٹا کہہ کر گود میں بٹھا کر گھنٹوں پیار کی باتیں کیا کرتا۔

"آپا! شنتو نگوڑے کو بیٹا کہتا ہے۔ بس تم ہی سمجھ لو کیا بات ہے!" وہ جھوم کر کہتی اور میرے کانوں میں مدن کی بارات کے ڈھول گونجنے لگتے۔ دیکھنے میں سندر کیسا لاابالی سا تھا۔ مگر بچوں کے معاملے میں اُس کا رویہ حیرت انگیز تھا۔ آتے ہی بچے اُسے شہد کی مکھیوں کی طرح گھیر لیتے۔ اُس کی جیبیں کیا تھیں، عمر عیار کی زنبیل تھیں۔ نگینے، پنسلیں، پٹاخوں کی ڈبیاں، کاغذ پہ اتارنے کی تصویریں، چاکلیٹ، میٹھی گولیاں، نہ جانے کیا الا بلا نکال کر بانٹنے لگتا۔ ایک دن بچی نے میری سنیٹ کی شیشی توڑ دی۔ میں نے اُسے مارنا چاہا، تو میرے ہاتھوں سے اُسے جھپٹ لے گیا۔

"آپ ماریں گی تو اُسے اپنے گھر لے جاؤں گا۔" وہ اُسے کندھے پر بٹھا کر بولا۔

"اُس نے میری شیشی توڑ دی ہے۔ ضرور ماروں گی۔"

qasarulkutub.blogspot.com

"ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے مارنے والوں کے۔ یہ لیجئے اپنی شیشی۔" اُس نے جیب سے ٹھیک ویسی ہی شیشی نکال دی۔ "مگر اُنہیں پوری شیشی نہیں دیں گے۔ آدھی تھی بس آدھی ملے گی۔" اُس نے شیشی کھول کر خوب بچوں کے بسانے کپڑوں اور میلی ہتھیلیوں پر چھڑکی۔ آدھی رہ گئی تو میرے سامنے ڈال دی۔ جب وہ بچوں کو بٹور کر دوسرے کمرے میں چلا گیا تو مدن نے رو کر میرے شانے پر سر ڈال دیا۔

"آپا، ایسے اوٹ پٹانگ آدمی کے ساتھ کوئی پیار کیسے نہ کرے؟"

اور پھر مدن کی زندگی نے ایک بنا جھٹکا کھایا۔ سندر کے گھر سے تار آیا کہ ماں سخت بیمار ہے، فوراً آجاؤ۔ مدن ساتھ جانے کے لئے مچل گئی۔ اُس نے اپنے ترکش کے سارے تیر استعمال کر ڈالے۔ شام سے ہی اُس کے لئے بکس کی پوٹلی کر پہنچی۔ اُسے رخصت کر دیا۔ بڑے نازک لمحوں میں ساتھ دے جانے کی قسمیں دیں مگر سندر ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ ساری رات جاگتی رہی۔ نہ سوئی، نہ سونے دیا مگر صبح ہوتے ہی پرندہ ساری تیلیاں جھٹک کر اُڑ گیا۔

ایرڈروم سے سیدھی میرے اوپر نازل ہوئیں۔ مجھے اس قسم کے مریل عاشقوں سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ مگر اُسے یوں تباہ حال دیکھ کر میرا جی پسیج گیا۔ جیسے برسوں کی بیمار۔ ایک ہی رات میں آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ مُنہ پر پھٹکار۔ یہ اُسے ہو کیا گیا ہے! میں دیر تک سوچتی رہی۔

میں کیوں اس کمبخت کے بارے میں سوچوں۔ دُنیا میں کتنے بڑے بڑے مسئلے ہیں۔ جن میں جی اُلجھا ہوا ہے۔ پھر آخر میں اس کا خیال کیوں کرتی ہوں۔ میں یہ سب کچھ کیوں لکھ رہی ہوں۔ مدن اس لائق نہیں۔ مجھے اپنا جی ہلکا کرنے کے لئے ہی سہی اس بوجھ کو بانٹنا ہوگا۔

کتنے دن سے جب میں قلم اُٹھاتی ہوں، مدن کا خیال مجھ سے آکر کہتا ہے "میں زندہ ہوں۔ میرے سینے میں دل دھڑک رہا ہے۔ میری رگوں میں خون دوڑ رہا ہے —— رائے دو —— مجھے بتاؤ، میں کیوں۔۔۔ ہوں اور کب تک رہوں گی؟" اچھا ہے، میرا قلم ایک بار مدن کو اُگل دے۔ پھر مِنتیاں آنی بند ہو جائیں گی۔

"آپا، ایک تار لکھو" اُس نے تھوڑی دیر سوکھی سوکھی آہیں بھر کر کہا۔

"کیسا تار؟"

"کم سون ڈارلنگ۔ یعنی جلد آؤ، مر رہی ہوں۔"

"مگر ابھی تو وہ پہنچا بھی نہ ہوگا۔" میں نے ٹالنا چاہا۔ پھر جان کو آ گئی تو لکھ دیا۔ ڈارلنگ نہ لکھا۔

شام کو ہانپتی کانپتی آئی، بڑی شرماتی ہوئی تکیے میں مُنہ چھپا کر ہنسنے لگی۔ میں نے کہا۔ "خیریت؟"

"تار لکھ دو۔"

"صبح تو لکھا تھا۔"

"صبح مجھے نصیبوں جلی کو کہاں معلوم تھا۔" وہ پھر شرمائیں۔ "اُبکائیاں آ رہی ہیں آپا، لیموں منگوا دو۔"

"اوہو —— یہ بات ہے! مُبارک ہو۔" میرے سر سے بوجھ سا اُتر گیا۔ یہ لیس چپکی کامیاب رہی۔ "ڈاکٹر کے پاس گئیں؟"

"وہیں سے تو آ رہی ہوں۔ ڈاکٹر حرامی پتّا کیا جانے۔ کہتا ہے دو دن چڑھ جانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کچھ نہیں ہوتا کا بچہ —— آپا! کپڑے وغیرہ سلوا دو گی —— بنیان، فلک۔ بھئی ہم سے تو نہیں سِلے گا۔ تم بنا دو گی؟" وہ ٹھنکنے لگی۔ میں نے حامی بھر لی۔

"تو پھر تار لکھو نا۔"

"کیا لکھوں؟"

"لکھو — سن بورن — کم سون۔"

"گدھی ہو تم۔ ابھی کہاں سے سن بورن؟"

"اچھا تو سن بورن ہونے والا لکھ دو نا۔"

"چلو سٹرن۔ اس کے آنے کا انتظار کرو۔ اندر کیسے معلوم، شاید لڑکی ہو۔"

"واہ، لڑکی چھنال کا ہے کو ہوگی۔ میری طرح سڑنے کو۔ میرا جی کہتا ہے لڑکا ہی ہوگا۔" پھر تھوڑی دیر سوچ کر ایک دم بولیں۔

qasarulkutub.blogspot.com

"مر جائے اللہ کرے۔"

"کون؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"سندر کی ماں! اور کون بھئی۔ بیمار ہو گیا۔ کچھ نہیں سنسنی نے اپنے یار کو بلانے کے لئے ڈھونگ رچایا ہے!" اُس نے نہایت پُر مغز قسم کی پھولدار گالیاں لگائیں۔

"احمق ہو تم، کیسے معلوم؟"

"ارے میں خوب جانتی ہوں ان کمینت چڑیلوں کو۔" جب سے مدن کی زندگی میں سندر آیا تھا اُس نے گالیاں بکنا بند کر دی تھیں۔ سندر کے پیار نے رستے زخموں پر پھائے رکھ کر غلاظت کا منہ بند کر دیا تھا اُس کی آنکھ اوجھل ہوتے ہی کچے زخموں کے منہ کھل گئے۔ پیپ بہنے لگی۔ اُس کے منہ سے پیپ زدہ ہی گالیاں سن کر میرا جی الٹنے لگا۔ مارے غصے کے مدن پٹاخوں کی لڑی بن گئی۔

"اس کا تعلق ہے۔"

"کس کا؟"

"اُس کی اماں بہنیا کا۔ سچی آپا، بہت سی عورتیں ایسی ہوتی ہیں کمینی۔۔"

"لعنت ہو تمہاری زبان پر۔"

"اللہ قسم آپا ——— ہمارے پڑوس میں ایک بیوی رہتی تھیں، اپنے سگے بھائی سے۔۔۔۔"

میں نے اُسے روک دیا۔ "لاللہ تفصیلوں میں نہ جاؤ۔ میرا قلم پیٹ کا ہلکا ہے، کل کلاں کو منہ سے بات نکال بیٹھا تو لوگ مجھے اُلاہنا دیں گے۔"

دوسرے دن ماتم کناں پھر ٹوٹ پڑیں۔ کل جیسے ڈاکٹر کا کہنا ہی ٹھیک نکلا۔ دن چڑھ گئے تھے، سو اُتر گئے۔ ساتھ ساتھ مدن کی کمان بھی اُتر گئی۔ ایسی بلک بلک کر روئی جیسے جوان بیٹا جنازہ رہا ہو۔ یہ عورت ہے یا لطیفہ۔ کل جس بلا کے خوف سے بوکھلائی پھر رہی تھی۔ آج اُس کی یاد آ آ کر میں جان دیئے دیتی ہے۔ لگیں مجھ سے ترکیبیں پوچھنے۔ بھلا میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہے جو بچے کو گھوڑا بنا دوں۔ ڈاکٹر نے کچھ اشارہ تو کیا تھا کہ آئندہ ایسی مصیبت سے پالا نہیں پڑے گا۔ میں اُسے باوجود کوشش کے نہ بتا

سکی کہ سندر کو پھانسنے والی چال کے پیر مفلوج ہو چکے ہیں۔

صبح شام مدن نے تاروں کی ڈاک بٹھا دی۔ کام بنا اُس نے لات مار دی۔ ایک پروڈیوسر نے کورٹ میں لے جانے کی دھمکی دی تو وہ ناک پر ڈھیر سا مرہم تھوپ کر پڑ گئی۔ میں بھی مرہم کی مقدار دیکھ کر دہل گئی ——— گئی ناک! میں نے سوچا۔ مگر جب پروڈیوسر چلا گیا تو منہ سے ناک پونچھ کر ہنسنے لگی۔

"مگر مجھے بے وقوف کیوں بنایا تم نے؟" میں نے چڑ کر کہا اور چلی آئی۔

اخباروں میں اسقاط کی خبریں چھپنے لگیں۔ مدن نے ذرا شرما کر تصدیق کر دی، میں نے پوچھا "یہ کیوں؟"

"سندر کو پتہ چلے گا تو بہت کڑھے گا۔ میں کہہ دوں گی، میں سمجھی تم چھوڑ کر چلے گئے۔ بدنامی کے ڈر سے گولیاں کھا لیں۔ مرد بچہ ہے کچھ تو دل کو ٹھیس لگے گی۔"

ایک دن حواس باختہ روتی ہوئی آئی۔

"تم نے مجھے نہیں جانے دیا۔ یہ دیکھو" وہ اخبار جس میں سندر کی منگنی کی خبر تھی، دکھا کر لڑنے لگی۔

"چہ خوش، میں نے کب منع کیا؟" میں نے جل کر کہا "جاؤ میری بلا سے جہنم میں۔"

اور وہ شام کے ہوائی جہاز سے جہنم کی طرف اُڑ گئیں۔

گیارہ بجے رات کو جب وہ سندر کے گھر پہنچیں تو گھر میں سوائے بوڑھے دادا اور نوکر کے کوئی نہ تھا۔ سب کے سب سندر کی کوئی فلم دیکھنے گئے تھے۔ سندر کے دادا فلم لائن کے ایسے ہی خلاف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان فلم والوں کے چال چلن کچھ یوں ہی ورق سے ہوتے ہیں۔ پھونک ماری اور غائب۔ آنکھیں پھاڑ کر وہ مدن کو گھورنے لگے۔ مدن ننگی سے کم کیڑے بھی پہن کر نہیں گئی تھی۔ کیونکہ الگ لگ رہی تھی۔

بارہ بجے کے بعد سندر بہن بھائیوں کی ٹولی میں ہنستا قہقہے لگاتا آیا تو مدن رو پڑی۔ کیا وہ بھی کبھی یوں خاندان میں گھل مل کر ان کی اپنی بن سکے گی۔ اُس کے بھی دیدہ

جیٹھ ہوں گے، نندیں اور دیورانیاں ہوں گی۔

"بہو، لڑکا رو رہا ہے، بھوکا ہے" ساس کہے گی۔ اُس نے پکّا ارادہ کر لیا۔ وہ اپنی ساس سے کبھی نہیں لڑے گی۔ نندوں کی خوب خاطر کرے گی۔ دادا کا حقّہ بھرے گی۔ اور توتے کو بھیگے چنے کھلائے گی۔ سندر کو دیکھ کر اُس کا جی چاہا کہ دوڑ کر اُس کے چوڑے چکلے سینے سے لپٹ جائے اور اُسے مٹھیوں سے کوٹ ڈالے۔ اس کے بھورے گھنے بالوں میں انگلیاں ڈال کر نوچ ڈالے۔ مگر ساس نندوں کی شرم نے اس کے پیر تھام لیے۔

اُسے دیکھ کر سندر کے حلق میں قہقہہ لوہے کا گولا بن کر اٹک گیا۔ ماں بہنوں کے سامنے اپنی داشتہ کے وجود سے شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ مصنوعی خوش مزاجی سے بولا۔ "ارے آپ!"

"آپ کے بچے!" مدن نے دانت پیسے۔ مگر سندر کی گھبراہٹ پر ترس کھا گئی۔

"جوہری سے کچھ زیور بنوائے تھے۔ چاندنی کندن کا کام دلّی جیسا بمبئی میں نہیں ہوتا۔ سوچا۔ دلّی کی سیر بھی ہو جائے گی۔ اور زیور بھی دیکھ لوں گی" سندر مدن کی اعلیٰ ایکٹنگ کا قائل تھا۔ آج تو لوہا مان گیا۔

جب اُس کو سندر کی بہنوں کے کمرے میں سُلایا گیا تو وہ بمشکل گالیوں کی زنجیر کو نگل سکی جو اُس کے حلق میں اُلجھنے لگی۔ خیر جب سب سو جائیں گے تو سندر اُس کے پاس آئے گا۔۔۔ سب سو گئے اور وہ سندر کے پیروں کی چاپ کے انتظار میں پڑی رہی۔ اُس کا جسم سندر میں جذب ہونے کے لئے ترس رہا تھا۔ راستے بھر کیسے کیسے تمناؤں کے جال بنتی آئی تھی۔ سندر سو رہا ہوگا۔ وہ چپکے سے پہلو میں رینگ جائے گی۔ اُسے محسوس کر کے سندر جھوم اُٹھے گا۔ پہلے وہ خوب ترسائے گی، خوب روٹھے گی۔ پھر دونوں من جائیں گے۔ ساری کسک، ساری دوری مٹ جائے گی۔ سارے راستے وہ اسی حادثہ کو دل میں دُہرا کر چٹخارے لیتی آئی تھی۔ اسی لئے تو وہ اپنی جھاگ سی نائٹی لیتی آئی تھی جو ہاتھ کے لمس سے دھوئیں کی طرح پگھل کر غائب ہو جاتی تھی۔

مدن سندر کے پیروں کی چاپ سننے کے لئے بیقرار ہمہ تن گوش بن گئی۔ دبے پیروں سے وہ پلنگ سے اُٹھا ہوگا۔ اس نے منظر نامہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ اُس کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہوگا۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ اُس نے اندازے سے وہ سارے قدم گن ڈالے، جو اُس کے اور سندر کے درمیان حائل تھے۔ گنتے گنتے وہ تھک گئی۔ اگر وہ ہزار میل پر ہوتا تو بھی اب تک پہنچ چکا ہوتا۔ وہ روہانسی ہو گئی۔ احساس کے تناؤ سے کنپٹیاں بھیگے چمڑے کی طرح کسنے لگیں۔ شاید سندر کے بھائی جاگ رہے ہوں گے اور وہ اُن کی موت کی دعائیں مانگنے لگی۔

سندر کی گلگوتھنا سی بھولی بھالی بہنیں کیا میٹھی نیند سو رہی تھیں، اُن کے خواب کتنے سہانے تھے۔ اُن کے دلوں میں کسی بے وفا کے پیار کے زخم نہیں پڑے تھے۔ اُسے غصّہ آنے لگا۔ اے کاش، کوئی اُن کا جہاں بھی لوٹ لے، اُن کے پیٹوں میں سانپ چھوڑ دے کہ یہ بھی گھور اندھیارے میں کسی کے پیروں کے نشان ٹٹولتی پھریں۔ تب سندر کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔

آخر کس جرم کی سزا میں اُس کا بچپن اتنا ویران اور جوانی زخم زخم ہو کر رہ گئی تھی۔ اُس سے زیادہ نہ ضبط ہو سکا۔ اور وہ سندر کے کمرے کی طرف چلنے لگی جہاں وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ سو رہا تھا۔

وہ جیسے ہی باہر نکلی۔ توتا اجنبی صورت دیکھ کر آنکھوں کے لٹو گھمانے لگا۔

"کون ہے؟" دادا نے ہانک لگائی۔ وہ چوروں کی طرح کھمبے کے پیچھے دبک گئی۔

دادا اُٹھے اور جوتے پہن کے آدھ گھنٹے تک رفع حاجت کرتے رہے۔ اُدھر گیا بڈھا شاید کہ پلٹا ہی نہیں کہ وہ سائے سائے پھر چلی، ایک سیڑھی سے پیر اُلجھا اور دھڑام سے گری۔ گھر میں جاگ ہو گئی اور وہ پھر اپنے پلنگ پر جا کر دبک گئی۔

صبح موقع پاتے ہی اُس نے سندر سے کہا۔ "کسی طرح بمبئی چلو بیٹا، ورنہ خون خرابے ہو جائیں گے۔"

"تم نے تار تو دیا ہوتا۔ کسی ہوٹل میں انتظام کرا دیتا۔"

"کیوں۔ کیا جاگیر میں ٹوٹا آیا جا رہا ہے؟ ۔۔۔ میرے کیوں جانے ہوٹل کے پیسے لینا۔"

"ڈراموں کی بات نہیں میری جان! میرے گھر والے بڑے نیر دماغ ہیں، فلم والوں کو پسند نہیں کرتے۔"

"تم بھی تو فلم والے ہو۔"

"میری اور بات ہے ۔ تم شام کو گاڑی سے چلو، پرسوں میرے بہنوئی آ رہے ہیں ۔ اُن سے مل کر ۔ ۔ ۔ "

"تو میں بھی نہیں جاؤں گی" بڑی جھک جھک کے بعد یہ طے ہوا ۔ مدن بظاہر بمبئی کیلئے روانہ ہو جائے، ایک اسٹیشن بعد نئی دہلی اُتر کر کسی ہوٹل میں ٹھہر جائے ۔ سندر وہیں آجائے گا ۔ بڑی دھوم دھام سے سارا گھر مدن کو اسٹیشن پہنچانے گیا ۔ وہ ایک دم فلم سٹار بن گئی چھوٹے بھائیوں نے تو ہار بھی پہنائے ۔

نئی دہلی اُتر کر وہ ہوٹل میں ٹھہر گئی ۔

دو پیاسے انسان ایک دوسرے میں غرق ہو گئے ۔ مدن کے سارے دُکھ دور ہو گئے وہ انتظار کی گھڑیاں ۔ وہ لا متناہی فاصلہ سب سندر کے پیار نے پاٹ دیا مگر باوجود خوشامد کے سندر رات گزارنے پر راضی نہ ہوا ۔ "میری ماں میرے بغیر رات بھر بنا کھائے بیٹھی رہے گی"

"تمہاری اماں کی ۔ ۔ ۔ " وہ موٹی سی گالی چبا گئی ۔ سُندر کی جان کو آ گئی ۔ اس کے کپڑے چھپا دئیے اُس کے جوتے گود میں دبا کر بیٹھ گئی ۔ دس مرتبہ دروازے سے بار بار خدا حافظ کہنے کو پلٹا پر مگر جانے والے کو نہ روک سکی ۔ وہ اُسے سونے اجنبی بستر پر سسکیاں بھرتا چھوڑ کر چلا گیا ۔

دوسرے دن سندر حسبِ وعدہ آ گیا ۔ مدن نے پورا ایکس بیئر کی بوتلوں کا برف میں لگا کے رکھا تھا ۔ آتش دان میں دھیمی دھیمی آنچ اُٹھ رہی تھی ۔ مدن کی نائٹی پگھل رہی تھی ۔ سُندر بیئر پیتا رہا ۔ اور وہ اُس کی آغوش میں بکھرتی رہی ۔ کاش کوئی وقت کی لگام میں پکڑ کے روک دیتا ۔

یہ لمحے یوں ہی فضا میں معلّق ہو جاتے وہ اسی طرح سُندر میں تحلیل ہو جاتی اور دوئی کا سوال مٹ جاتا ۔ وہ پیتے رہے ۔ سوتے رہے ۔ پھر جاگ اُٹھے اور پھر سو گئے ۔

شام کو دونوں ننھے بچوں کی طرح ٹب میں چہلیں کرتے رہے ۔ باہر کی دُنیا اُن کے لئے ختم ہو چکی تھی ۔ گیلے بدن آتش دان کے پاس دو زانو ہو کر اُنھوں نے اپنی دُنیا پا لی تھی ۔

دن بھر کی بیئر کا نشہ پھیکا پڑنے سے پہلے ہوس کا رنگ چڑھنے لگا ۔ مدن کسی نہ کسی بہانے سے سُندر کو لگائے رکھنا چاہتی تھی ۔ اگر اس کا بس چلتا تو

اُس کی ممی بنا کر تکیہ پہ سلا دیتی ۔ اور پھر اُس کے مُنہ پہ منہ رکھ کر ابدی نیند سو جاتی ۔ بس نہ تھا جو اُسے ساری دُنیا سے چھین کر اپنے دل کے کسی کونے میں قید کر دے اور ایسا زبردست تالا ڈالے کہ لاکھ سر پٹکے نہ کھلے ۔

مگر بیئر نہ وھسکی! سُندر کے جاتے قدم ڈگمگا نہ سکے ۔ مدن پر بھوت سوار ہو گیا ۔ سندر نے حسبِ معمول اُس کی ٹھکائی شروع کی ۔ اتنی زور سے اس کی پسلی میں لات ماری کہ آنکھیں نکل پڑیں گھبرا کر اُس نے پھر سے اُسے باہوں میں سمیٹ لیا ۔ بس یہی ادا تو مدن کے من کو بھا گئی تھی اُسے ۔ یوں بکھیرنے اور سمیٹنے ہی میں لُطف آنے لگا تھا ۔ اس چار چوٹ کی مار ہی میں لذت ملنے لگی تھی ۔ مدن تو چاہتی ہی تھی کہ وہ اسے اتنا مارے، اتنا مارے کہ ہڈیاں چکنا چور ہو جائیں ۔ تب وہ اُسے چھوڑ کر نہ جا سکے گا ۔

مگر خاندان والوں کی دہشت مدن کے پیار سے زیادہ مہیب ثابت ہوئی اور وہ چلا گیا ۔ اور مدن صبح تک آہیں بھرتی رہی، تڑپتی رہی ۔

کاش وہ لنگڑا، لولا اور اپاہج ہوتا، اُس کے سب جاننے والے اُسے بھول جاتے اور وہ صرف اُس کا ہو کر رہ جاتا ۔ بمبئی میں سندر کو ایک مرتبہ بخار آیا تھا دُنیا کو لات مار کر وہ اُس کی پٹی سے لگ کر بیٹھی رہی ۔ نہ اُس کے گھر خبر کی ۔ نہ ملنے جلنے والوں کو آنے دیا ۔ بیٹھی مسلسل اُس کے جلتے ہوئے ہونٹ چومتی رہی ۔ پھر بھی چین نہ پڑا تو بخار میں جھلستے ہوئے جسم سے لگ کر سو رہی ۔ خواب میں اُس نے دیکھا گرم گرم سنہری آنچ میں وہ پگھلتی جا رہی ہے، اور وہ سندر کے جسم پر خول بن کر منڈھ گئی ہے ۔ اس کے رشتہ دار کسی جتن سے بھی مدن کا پلستر نہ کھرچ سکیں گے ۔ ڈاکٹر نے اُسے ڈرایا کہ اگر وہ گھنٹے میں ہزار بار اُسے تنگ کرے گی تو وہ اچھا نہ ہو سکے گا ۔

خدا خدا کر کے رات بیتی اور دن ہوا ۔ سندر کہہ گیا تھا کہ شاید وہ دیر سے آئے ۔ لمحے پہاڑ ہو گئے ۔ دیوانی بلی کی طرح وہ ہوٹل میں چکر کاٹتی رہی پھر نکل کے شہر کی خاک چھان ڈالی ۔ دو جوڑے لائی تھی ۔ جو چیکیٹ ہو گئے تھے اُس کی اُجاڑ

qasarulkutub.blogspot.com

صورت پر کسی کو فلم سٹار ہونے کا گمان بھی نہ تھا۔ ایک سینما ہال پر مفت لگے ہوئے تھے وہاں مدن کی ہٹ فلم چل رہی تھی۔ اُس کا جی چاہا تانگے پر کھڑی ہو کر ڈوپٹہ ہوا میں لہرا کر وہی گیت گانے لگے جسے لوگ سُننے کے لئے دس دس مرتبہ جاتے تھے۔ مگر اس نے ٹال دیا۔ گانے کی آواز تو لتا کی تھی۔ اُس کی اپنی آواز تو رات بھر کی جگار سے پھٹا بانس ہو رہی تھی۔

کروڑوں کے دل کی ملکہ تنہائیوں کی رانی نے بھرے شہر میں سنسان دل لئے تنہا وحشیوں کی طرح جب چکر کاٹتے کاٹتے بے حال ہو گئی تو وہ کوئے جاناں کی طرف چل دی۔ مگر وہاں جا کر معلوم ہوا سارا خاندان اُٹھ گیا ہوا ہے۔ منگنی کی خبر سچ ہی نکلی۔

مسز جھاڑ جھنکاڑ، وہ سیدھی اسٹیشن سے میرے یہاں چڑھ دوڑی۔ نہ جانے کے [illegible] سے تنہائی اور ذلت [illegible] مجھے رانی بدصورت فلمی حور میں نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں نے مدن سے بہت کہا، "دو نہا ڈالو۔ کچھ کھا لو۔"

"اب تو اس سُندر حرامزادے کی بھتنی ہو کر چھوڑوں گی۔ بتاؤ آپا کیا کروں؟ اس کمینے نے مجھے خراب کیا۔ اور اب بیاہ رچا رہا ہے۔"

"اب بزمت۔ تم پہلے ہی سے خراب تھیں۔" میں نے جل کر کہہ دیا۔

"آپا تم بھی اب کہہ رہی ہو۔ تم تو بڑی روشن خیال ہو۔"

جی چاہا اُسی کے لہجے میں کہہ دوں۔

"روشن خیال کی دُم! بھلا اس سے زیادہ روشن خیالی اور کیا کر سکتی ہوں کہ تمہاری اس نامُراد زندگی کا الزام تمہاری محرومیوں اور رامٹ تنہائی کے سر تھوپ دوں۔ کیا میں تمہاری بیتی ہوئی زندگی کے قدم پلٹ کر نئی راہ پر ڈال سکتی ہوں؟ کیا بہ زبردستی حلق میں اُتارا ہوا زہر جو تمہاری رگوں میں جذب ہو گیا ہے نچوڑ کر نتھار سکتی ہوں کہ تم الگ اور زہر الگ؟ نہیں، یہ زہر تو اب گرفت سے باہر ہو چکا ہے۔"

"تم نہیں جانتیں آپا۔" اُس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ اور میں نے سوچا بے شک میں نہیں جان سکتی۔ تم جانتی ہو کہ وہ زندگی انسان کو کیا بنا دیتی ہے جہاں نہ

ماں کا پیار، نہ باپ کی شفقت، نہ بھائیوں کے پیار بھرے گھونسے نہ بہنوں کی میٹھی میٹھی چٹکیاں۔ تم تھوہڑ کا پودا ہو۔ نہ پھول نہ پھل۔

سُندر سے ملنے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ جن فلموں میں وہ کام کر رہے تھے وہ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں بننے لگیں۔

ایک دن نہ جانے کیسے سُندر کے فلیٹ میں گھس گئی۔ وہ پچھلے دروازے سے نکل بھاگا۔ مارے غصے کے مدن دیوانی ہو گئی۔ اُس نے پھاٹک پر اُسے گریبان سے جا پکڑا۔

"خون کر دوں گی حرامزادے۔" وہ غرائی۔ وہ بھیگی بلی بنا اس کے ساتھ کمرے میں چلا آیا۔

"کیا چاہتی ہو۔" اُس نے بجائے مارنے پیٹنے کے نرمی سے کہا۔ کاش وہ مارتا پیٹتا تو یہ غیرت کی دیوار ٹوٹ جاتی! وہ اُسے مار کر سمیٹ تو لیتا مگر نہیں، وہ مارنا بھی اپنی ہتک سمجھ رہا تھا۔

"مجھے نوکر سمجھ کر رکھ لو۔ تمہاری ماں کے پیر دھو کر پیوں گی۔ سُندر! انہیں پلنگ پر بٹھا کر راج کراؤں گی۔ تمہارے نوکر کتنا پیسا چراتے ہیں۔ میں تمہاری نوکر بن کر رہوں گی۔"

"مگر ـــ" وہ ہکلایا۔ "سچی بات تو یہ ہے بھئی، میں شادی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔" مگر مدن سمجھ گئی کہ اونچے گھرانے کا پوت ایک بیسوا سے بدتر عورت کو کیسے بیاہ سکتا ہے! وہ خود ہزاروں عورتوں کے ساتھ رہ کر بھی کنوارا ہے۔ اُس کنواری سے بھی زیادہ پاک اور مقدس جس کا کنوارپن کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہو!

مرد سدا کنوارا ہی رہتا ہے! بہتے کے کنوئیں کی طرح جس میں کوڑھی بھی پانی پی لے تو گندا نہیں ہوتا۔ اور [illegible] کنواری بھی جو سائے سے بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔

مدن کا خون کھول سا گیا۔ سارے [illegible] ہو کر چھلک گئے۔ پہلے تو اُس نے نہایت بھونڈے قسم کی مغلظات سُندر کے جسم جسم کو سُنائیں۔ سارے گھر کی چیزیں توڑ ڈالیں۔ تیل کی بوتل سے آئینے کے پرخچے اُڑا دیئے۔ الماری سے گلاس اور برتن نکال کر چھنا چھن بجا دیئے۔ ننھے سوٹ نکال کر بلیڈ سے دھجیاں اُڑا دیں [illegible] مقام ہونے

dasarulkutub.blogspot.com

بنیائن ہاتھوں سے کھسوٹ ڈالے، سارے شیشے ٹینس کے ریکٹ سے پھوڑ ڈالے، نئے قیمتی جوتوں کی فنکار کی چاقو سے بوٹیاں اُڑا دیں، دیواروں سے فریم اُتار کر جوتوں سے کوٹے پھر سُندر کی میلی قمیض میں منہ ڈال کر رونے لگی۔

سُندر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ جب مدن نے مُنہ سے میلی قمیض ہٹائی تو وہ جا چکا تھا۔

مدن نے پھر میرے گھر پر چڑھائی کی۔ گھنٹوں مجھ سے سُندر کو قتل کرنے کی ترکیبیں پوچھتی رہی۔ وہ اُسے جھٹ سے نہیں مارنا چاہتی تھی۔ رنجھا کر مارنا چاہتی تھی۔ کہ ساری عمر سسکے اسی طرح۔

"نامرد کر دوں سُور کے بچے کو۔"

"مجھے ایسی کوئی ترکیب نہیں معلوم۔" میں نے چڑ کر کہا۔

"اُس کی آنکھوں میں تیزاب ڈال دوں۔ ساری عمر کو اندھا ہو جائے۔"

مگر نہ سُندر نامرد ہوا نہ اندھا، مہینے بھر کے اندر وہ کومل سی بہو بیاہ لایا۔ اچھوتی کنواری جیسے فرشتوں نے بھی ہاتھ نہ لگایا تھا، مہینوں دولھن دولھا کی فلم انڈسٹری میں دعوتیں ہوتی رہیں۔

اگر صدمے سے مدن خودکشی کر لیتی یا گھل گھل کر مر جاتی تو میری کہانی کا کتنے سلیقے سے خاتمہ ہوتا اور پھر میں لکھتے وقت ذہنی تسکین محسوس کرتی۔ مگر وہ پیندے پر سیسہ لگے ہوئے کھلونے کی طرح لوٹ پوٹ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسی ہی ایک دعوت میں وہ ایک پستہ قد نئے لڑکے کے ساتھ وہی اپنے ازلی کھردرے قہقہے لگا رہی تھی۔ وہ لطیفے چھوڑ رہا تھا۔ مدن کو اچھو لگ رہے تھے اور منہ کے نوالے وہ پاس کھڑے ہونے والوں پر چھڑک رہی تھی۔ سُندر بھی اسی میز پر اپنی شرمیلی دولھن کو خستہ سموسے کھلا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مدن میرے کان میں گھس پھسائی۔

"آپا کیا رائے ہے۔ شادی کر لوں؟"

"کس سے؟" میں نے اُکتا کر پوچھا۔

"ورشن سے، مرتا ہے حرامزادہ۔ کہتا ہے زہر کھا لوں گا تمہارے لئے" وہ نئی دولھن کی طرح شرمائی۔

"ضرور کر لو۔ نیک کام میں دیر کیسی؟"

اس بات کو کتنے سال گزر گئے، مگر اس وقت تک جبکہ میں یہ آخری سطریں لکھ رہی ہوں، مدن کنواری ہے! اس کے سہرے کی کلیاں منہ بند ہیں۔ جوہو میں بنگلہ لینے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔ وہ خوبصورت سا بنگلہ جہاں مدن بیگم بیٹھی ہیں، بچے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔

"اماں کھانا دو۔ اماں کھانا دو!" اور وہ انھیں کفگیر سے مار رہی ہے۔ بچوں کا باپ مسکرا رہا ہے۔

"مارتی کیوں ہو بیگم، بچے ہیں۔"

qasarulkutub.blogspot.com

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جاجم بچھی تھی۔ ٹوٹی ہوئی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلّا اُٹھتا۔

"نائیں نائیں! میرے لال!"

دُبلی پتلی ماں اُسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو۔ بچّے ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتے۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لئے گئے تھے، مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملے میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ اُن کے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے۔

کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلے میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی، کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کان نکال لیتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں، کبھی چوکھونٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا، گریبان کیلئے کترن میری بقچی سے لے لو۔" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔ پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی۔ جب ہی تو سب کی سب دم سادھے اُن کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکن نہ تھی۔ چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس اُن کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا اور اُداس اُداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں۔ جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اُٹھی ہو، اور اُنھوں نے مسکرا کر قینچی اُٹھا لی۔

محلّے والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچّے ٹھسکا دئے گئے۔ چیل جیسی تیز نگاہوں والی کنواریوں نے لپا جھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پرو دئے۔ نئی بیاہی دُلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی تھیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی تھیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی۔

کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اُس کے زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اُٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو اُن کا مرجھایا ہوا چہرہ عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اُٹھتا۔ گہری خندقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی

طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پہ زری کا کام بنتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں اس شنی ڈوپٹے سے پہلے اور کتنے ڈوپٹے بنے ٹکے تیار ہوئے اور کاٹھ کے بھاری تابوت جیسے صندوق کی تہہ میں ڈوب گئے۔ کنگوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے۔ مگر کبریٰ کی بارات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ نئی چھان بین کے ساتھ نئی اطلس چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلے کی عورتیں منہ میں پان اور بغل میں بچے دبائے جھانجھن بجاتیں آ پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو نکل آئے گی، پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا اور سنو، تو کیا نگوڑی ماری تول کی بچیاں پڑیں گی؟"

اور پھر سب کے چہرے فکرمند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھ کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑوں کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہے لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی جیالی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی۔ بے ہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقع پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دیا جاتا۔ اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ "اللہ یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے۔"

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلے پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی کہ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں

کان آ جائے یا مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پہ جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی، سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے روز سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کترن بچتی تو تیلے دانی یا شیشے کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے۔ کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے۔ جو بارات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گزرے سلیقے کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے تھے، لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینے میں بے طرح الجھتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آ کر انھیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے۔ ایسی بھی کیا ہنسی!"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکرانے لگتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک جیسے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے، کتنی بار کہا تم سے؟"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ۔ روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن کھاؤ۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی اوپر سے چکنائی۔ بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔"

"دکھاؤں گا۔"

ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

qasamulkutub.blogspot.com

"آگ لگے اس مُوئے حقّے کو۔ اُسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر ......؟"

اور اب ابّا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی؟ وہ تو بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناوُنی سُن کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں پریاں ناچیں، نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں، نہ اس کے سینے میں طوفان اُٹھے، نہ کبھی اُس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی، سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اُس پر رینگ آئی، ویسے ہی چُپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابّا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آ سکا۔ اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔ اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اُٹھ رہی ہے۔ مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔ انہوں نے کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گذارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ اُن کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو راحت نہیں، چوکھٹ پر برات آ کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے اُن کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا۔

"بہن میرا ہی مرا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشے کی لونگیں اُتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو، چھ ماشے سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اُس کی ہتھیلیوں کی کھال اُڑ گئی۔ اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کے دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے۔ دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آ رہے تھے۔

"اللہ میرے اللہ میاں، اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔"

حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سوئیوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ! میں دھو دوں بی آپا۔" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں۔" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی، بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے پر ٹپّا ٹانکتی رہیں۔ جس راستے کان کی لونگیں گئی تھیں اُس ہی راستے پھول پتّا اور چاندی کی پازیب بھی چل دیں اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے بھنتے، پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔" وہ حمیدہ کو منہ پھلائے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی۔ "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اُٹھ کر جادو کی مشین کی طرح کام پر جُٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اوٹاتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے۔ اُس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے اور کیوں نہ بھر دے، آخر کو ایک دن

qasrulkutub.blogspot.com

وہ مُکل کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اسی کی ہتھیلی پر رکھے گا۔ پھل دینے والے بودے پھول نہیں سینچتا۔ . . . پھر ایک دن جب پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال سے میری بی آپا کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سہاگ کھل اُٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو جھاڑتیں، اُن کے کپڑوں کو پیار سے تہہ کرتیں، جیسے وہ کچھ اُن سے کہتے ہوں۔ وہ اُس کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں، بسائندی بنیائن اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ اُس کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکیے کے غلاف پر SWEET DREAMS کاڑھتیں۔ پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح سویرے انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آکر کوفتے کھا کر سو جاتا۔ اور بی اماں کی منہ بولی بہن کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بیچارہ۔" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ پر بھی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج، خدا نہ کرے جو میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اس کا تو آنچل بھی نہیں دیکھا کسی نے۔" بی اماں فخر سے کہتیں۔

بی آپا میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔ "اری چل دیوانی۔"

"ہائے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات کیوں نہیں کرتی اکل کھری۔"

"بھیا ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی کھائے گا نا۔" بی اماں چڑ کر بولتیں۔

"نہیں تو . . . مگر . . . ." میں لاجواب ہو گئی۔

اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھلی کے کباب بنائے گئے۔ بہنوئی سے مذاق کرنے کے لئے۔ اُس دن آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں۔ چپکے سے بولیں "دیکھو ہنسنا نہیں۔ نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجیے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔

پھر جو چوکی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت راحت نے میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں سرپٹ بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ "اللہ توبہ! کیا خناس آنکھیں ہیں کمبخت کی۔"

"جا نگوڑی ماری، اری دیکھ تو سہی۔ وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کرکرا کر دیا۔"

بی اماں نے ٹوکا۔ مگر میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔

آپا جی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے بجھے اپنے جوڑوں کی مانند اُداسی۔ میں سر جھکائے جا کر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے۔ میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیئے تھا کہ مذاق اُڑاؤں، قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی واہ دولہا بھائی کھلی کھا رہے ہیں۔" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے بلا لیا اور منہ ہی منہ میں کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے۔ کمبخت کہیں مجھے ہی نہ کھا جائے۔

"راحت بھائی کوفتے پسند آئے؟"

بی اماں کے سکھانے پر پوچھنا پڑا۔

جواب ندارد۔

"بتائیے نا۔"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔" بی اماں نے ٹہوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دئیے اور ہم نے کھا لئے۔ مزیدار ہی ہوں گے۔"

"ارے واہ رے جنگلی۔" بی اماں سے نہ رہا گیا تو بول اُٹھیں۔ "تمہیں پتہ بھی نہ چلا۔ کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسا کھانے کا۔" راحت نے چپکے سے کہا۔

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں پھر نہ اٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دوگنی سلائی کی اور پھر شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے:

"کہیے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں۔ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کر اسے ہاتھی کی خوراک دیں، کبھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں۔ میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنّا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا بتایا ہوا نسخہ کام آگیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں۔ بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں۔ اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا۔ کھانا کھاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی۔ میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا، صاف کہہ دوں۔ کسی کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے الجھے ہوئے بالوں پر چولھے کی اڑتی ہوئی راکھ ۔ ۔ ۔ نہیں! ۔ ۔ ۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے دبا دیے۔ "ناس جائے اس کمبخت نزے کا۔ بے چاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔"

راحت نے پھر کسی بہانے سے پکارا۔

"اونہہ!" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔ کیا کہتی۔

"کہہ رہے تھے۔ کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ۔ جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں۔ پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔ نہیں ۔ ۔ ۔ کھا نہیں جاؤں بلکہ چوم لوں۔" میں نے کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیے کی بساند میں سڑتا ہوا ہاتھ اپنے گال سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ "یہ ہاتھ" میں نے سوچا "جو صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں، ان کی بیگار کب ختم ہو گی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہیں آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہیں بسے گا ۔ ۔ ۔ ؟" جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟"

بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ راحت کے کان ہوتے تو ۔ ۔ ۔ مگر راحت کے کان نہ تھے، نہ ناک، بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

"اور کہہ رہے تھے اپنی بی آپا سے کہنا اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔"

"چل جھوٹی۔"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اری چپ مردار۔" انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔"

"نہیں بی آپا۔ انہیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی

ضرورت ہے۔" میں نے کہنا چاہا۔ پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی۔ تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے۔ چولہے کے پاس تو ویسے ہی جھلس رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک آنکھ شرارت سے تان کر کہا۔

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بُنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا۔ اُس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے مٹی کے تودے! یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں، اُس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ اُن ہاتھوں کا بُنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ٹوٹا بٹن ٹانکنے اور پھٹا ہوا دامن رفو کرنے کیلئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو، گدھے کہیں کے۔ اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمھاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار نہ بجا سکیں گے۔ منی پور اور بھارت ناٹیم نہ دکھا سکیں گے۔ اُنھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا، اُنھیں پھولوں سے کھیلنا نصیب نہیں ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمھارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ چولہے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمھاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے اُن میں زخم ڈال دیے ہیں۔ اُن میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ اُنھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر دیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراونی موت کی باتیں۔ بھوک اور کال کی باتیں، دھڑکتے ہوئے دلوں کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔"

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کرتا کتنا باریک ہے۔"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اُس کا منہ، ناک، گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔

بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"کیا بولے؟" اُن سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا۔ یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔"

میں نے سوچا آج سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے ۔۔۔ یہ دیکھئے ۔۔۔ میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں۔" اُنھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کر کہا۔

"بی آپا ـــــ سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں ہیں۔" میں نے سلگ کر کہا۔ "آج بی اماں سے کہہ دوں گی۔"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جا نماز بچھاتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھئے میری چوڑیاں، بی اماں۔"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں۔"

"خوب کیا۔ تو اُسے ستاتی بھی بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔" پھر پچکار کر بولیں۔ "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔"

یہ کہہ کر اُنھوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی۔ اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر ازحد خوشنودی سے مسکرا دیا گیا۔

"اے ہے! تو تو بڑی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک

qasarulkutub.blogspot.com

بیں دم کر دیا کرتے تھے۔" منہ بولی بہن بولیں۔

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے میری ان دو بہنوں کی شادی کرائی تھی۔ جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقع ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے۔ جہاں بیچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں تو شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ بیٹھے کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں انہوں نے سنا کہ باہر آئے ہیں، لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیجتیں، کبھی سویوں میں نمک ڈال کے کھلا دیا۔

"اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے، پانی آئے، کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہ اُن کے ہاں شادی کرا دو—

پوچھا کہ بھئی کس سے؟"

کہا "کسی سے بھی کرا دو۔" اور خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بڑی بہن کی صورت یہ تھی کہ دیکھو تو جیسے بھیجا چلا جاتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ! ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے، اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

"ہاں بھئی، جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اُسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے۔" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن! آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بینگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکا دو اُدھر ہی لڑھک جائے گا۔"

"مگر راحت تو بینگن نہیں، اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ پر کہیں میں ہی پس نہ جاؤں۔" میں نے سوچا۔

میں نے پھر بی آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں۔ اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ اُن کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوارپنے کی لعنت

سمیت اُس میں سما جاتیں۔

کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں، وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصوّر اُس کے ذہن میں اُمنگ بن کر نہیں اُبھرا، بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر اُبھرا۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا۔

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود ہی پھوٹے نہ اُن کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کے بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی۔ دوپہر بھر محلے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھڑی میں اپنے خون کی آخری بوندیں چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں سہ دری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج اُن کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی نکل جائیں گی۔ آج اُن کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں اُن کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے اُن کا بخار نہیں اُترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح اُن کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا۔ اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے اُنہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" اُن کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں آ لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے . . . یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا ہے۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا! میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے بارات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہوا ہے۔ جو گھوڑے کے ایالوں کو چوم رہا ہے . . . .

qasrulkutub.blogspot.com

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں۔ چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے۔ بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اُٹھتی ہیں، شکریے کا آنسو افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح اُلجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری محبت کا پھل ہے" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے . . . . . .

حمیدہ کا گلا بھر آیا . . . .

"جاؤ نا میری بنو" بی آپا نے اُسے جگا دیا۔ اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ . . . . یہ ملیدہ" اُس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ اُس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو اور پہاڑ کھسکا۔ راحت نے منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں بارات کی شہنائیوں نے بیہنج لگائی۔ جیسے ان کا کوئی گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اُس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔ ایک جھٹکے سے اُس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا . . . نیچے، بہت نیچے، تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں۔ اور ایک بڑی سی چٹان نے اُس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین کے اوپر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلے کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اُس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اُسے جلدی تھی۔ اُس کے بعد اس گھر میں انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ پکے اور سوئیٹر نہ بُنے گئے۔ دِق جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے آ رہی تھی۔ ایک ہی جست میں اُنھیں دبوچ بیٹھی۔ اور اُنھوں نے جھکا کر اپنا نامراد وجود اُس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جُڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے اُن کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان ندیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں۔ جیسے ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور موت بھرا اطمینان تھا۔

کفن کے لٹھے کی کان نکال کر اُنھوں نے چوپرتا کیا اور اُن کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج اُن کے چہرے پر بھیانک سکون اور موت بھرا اطمینان تھا جیسے اُنھیں پکا یقین ہو کہ اور جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے گا۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر اُن کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر سفید گزی کا نشان۔ اُس کی سُرخی میں

نہ جانے کتنی معصوم دُلہنوں کا ارمان رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر اُبھری ہے۔ اور پھر ایک دم سب خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کر توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو اُن کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ اُن کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج اُنھیں اطمینان ہو گیا کہ اُن کی کبریٰ کا جوڑا بن کر تیار ہو گیا اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اُٹھیں گی۔

qasarulkutub.blogspot.com

چٹان

بھابی بیاہ کر آئی تھی تو مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ بڑھوار بھی تو پوری نہیں ہوئی تھی۔ بھیا کی صورت سے ایسی لرزتی تھی جیسے قصائی سے گائے مگر سال بھر کے اندر ہی وہ تو جیسے منہ بند کلی سے کھِل کر پھول بن گئی۔ جسم بھر گیا، بال گھنیرے ہو گئے۔ آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت دور ہو کر غرور اور شرارت بھر گئی۔

بھابی ذرا آزاد قسم کے خاندان سے تھی، کانونیٹ میں تعلیم پائی تھی۔ پچھلے سال اُس کی بڑی بہن ایک عیسائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس لیے اُس کے ماں باپ نے ڈر کے مارے جلدی سے اُسے کانونیٹ سے اُٹھایا اور جھٹ پٹ شادی کر دی۔

بھابی آزاد فضا میں پلی تھی۔ ہرنیوں کی طرح قلانچیں بھرنے کی عادی تھی۔ مگر سسرال اور میکہ دونوں طرف سے اُس پر کڑی نگرانی تھی۔ اور بھیا کی بھی یہی کوشش تھی کہ اگر جلدی سے اُسے پکی گھرستن نہ بنا دیا گیا تو وہ بھی اپنی بڑی بہن کی طرح کوئی گل کھلائے گی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھی۔ لہٰذا وہ اُسے گھرستن بنانے پر جٹ گئے۔

چار پانچ سال کے اندر بھابی کو گھس گھسا کے واقعی سب نے گھرستن بنا دیا۔ وہ

تین بچوں کی ماں بن کر سنجیدہ اور ٹھس ہو گئی۔ اماں اُسے خوب مُرغی کا شوربا، گوند سٹورے کھلاتیں۔ بھیا ٹانک پلاتے اور ہر بچے کے بعد وہ دس پندرہ پونڈ بڑھ جاتی۔

آہستہ آہستہ اُس نے بننا سنورنا چھوڑ ہی دیا تھا۔ بھیا کو لپ اسٹک سے نفرت تھی۔ آنکھوں میں منوں کاجل اور مسکارا دیکھ کر وہ چڑ جاتے۔ بھیا کو بس گلابی رنگ پسند تھا۔ یا بہت ہی سرخ ——— بھابی بھی زیادہ تر گلابی یا سرخ ہی کپڑے پہنا کرتی تھی۔ گلابی ساڑھی پر سرخ بلاؤز یا کبھی گلابی کے ساتھ ہلکا گہرا گلابی۔

شادی کے وقت اُس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ مگر دولہن بنتے وقت ایسے تیل چپڑ کر باندھے تھے کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ پرکٹی میم ہے۔ اب اُس کے بال خوب بڑھ گئے تھے لیکن پے در پے بچے ہونے کی وجہ سے وہ ذرا گنجی سی ہو گئی تھی۔ ویسے بھی وہ بال کس کر میلی دھجی ہی باندھ لیا کرتی تھی۔ اس کے میاں کو وہ میلی کچیلی ایسی ہی بڑی پیاری لگتی تھی۔ اور میکے سسرال والے بھی اُس کی سادگی کو دیکھ کر اُس کی تعریفوں کے گُن گاتے تھے۔ بھابی تھی بڑی پیاری سی۔ سجیل نقشہ، مکھن جیسی رنگت، سڈول ہاتھ پاؤں۔ مگر اس نے اس بری طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا کہ خمیری آٹے کی طرح بہہ گئی تھی۔

بھیا اُس سے نو برس بڑے تھے، مگر اُس کے سامنے لونڈے سے لگتے تھے۔ ویسے ہی سڈول کسرتی بدن والے، روز ورزش کرنے، بڑی احتیاط سے کھانا کھاتے بڑے حساب سے سگریٹ پیتے، یوں ہی کبھی وسکی بیئر چکھ لیتے۔ اُن کے چہرے پر اب لڑکپن تھا۔ تھے بھی بس اکتیس برس کے مگر چوبیس پچیس برس کے ہی لگتے تھے۔

اُن بھیا کو جین اور اسکرٹ سے بڑی نفرت تھی۔ انھیں یہ نئے فیشن کی بے آستینوں کی بدن پر چپکی ہوئی قمیض سے بھی بڑی گھن آتی تھی۔ تنگ موری کی شلواروں سے تو وہ ایسے جلتے تھے کہ توبہ خیر بھابی بیچاری تو شلوار قمیض کے قابل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ وہ تو بس زیادہ تر بلاؤز اور پیٹی کوٹ پر ڈریسنگ گاؤن چڑھائے گھوما کرتی۔ کوئی جان پہچان والا آجاتا تو بھی بے تکلفی سے وہی اپنا نیشنل ڈریس پہنے رہتی۔ کوئی پُرتکلف مہمان آتا تو عموماً وہ اندر ہی بچوں سے سر مارا کرتی۔ جو کبھی باہر آنا پڑتا تو ململی سی

qasarulkutub.blogspot.com

ساڑھی لپیٹ لیتی۔ وہ گھر ہستن تھی، بہو تھی اور چہیتی تھی، اُسے رنڈیوں کی طرح بن سنور کر کسی کو لبھانے کی کیا ضرورت تھی۔

اور شاید بھابی یونہی گوڑ ہی ادھیڑ اور پھر بوڑھی ہو جاتی۔ بہوئیں بیاہ کر لاتی جو صبح اٹھ کر اُسے جھک کر سلام کرتیں گود میں پوتا کھلانے کو دیتیں مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شام کا وقت تھا، ہم سب لان پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابی پاپڑ تلنے باورچی خانہ میں گئی تھی۔ باورچی نے پاپڑ لال کر دئے بھیا کو بادامی پاپڑ بھاتے ہیں۔

اُنھوں نے پیار سے بھابی کی طرف دیکھا اور وہ جھٹ سے اُٹھ کر پاپڑ تلنے چلی گئی۔

ہم لوگ مزے سے چائے پیتے رہے۔ ملئے بھابی تھی کہ فرشتہ۔ میں تو کالج سے آکر باورچی خانہ میں جانے پر کسی طرح مجبور نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور نہ ہی میرا شام کا پُر تکلف لباس باورچی خانہ کے لئے موزوں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پاپڑ تلنا ہی کب آتے تھے۔

دوسری بہنیں بھی میری قطار میں کھڑی تھیں۔ فریدہ کا منگیتر آیا تھا۔ وہ اُس کی طرف جھکی ہوئی تھی، رضیہ اور شمیم اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں لڑانے میں مصروف تھیں۔ وہ کیا پاپڑ تلتیں۔ اور ہم سب تو بابل کے آنگن کی چڑیاں تھیں اور اُڑنے کے لئے پر تول رہی تھیں۔

دھائیں سے فٹ بال آکر عین بھیا کی پیالی پر پڑی۔ ہم سب اُچھل پڑے۔

بھیا مارے غصّہ کے بھنّا اُٹھے۔

"کون پاجی ہے؟" اُنھوں نے جدھر سے گیند آئی تھی اُدھر دیکھ کر ڈانٹا۔

بکھرے ہوئے بالوں کا گول مول سر اور بڑی بڑی آنکھیں اوپر سے جھانکیں

ایک زقند میں بھیا منڈیر پہ تھے اور مجرم کے بال اُن کی گرفت میں۔

"اوہ!" ایک چیخ گونجی اور دوسرے لمحے بھیا ایسے اُچھل کر الگ ہو گئے جیسے اُنھوں نے بچھو کے ڈنک پر ہاتھ ڈال دیا ہو۔ یا انگارہ پکڑ لیا ہو۔

"سوری ـــ آئی ایم ویری سوری ـــ" وہ ہکلا رہے تھے۔ ہم سب دوڑ کر گئے۔ دیکھا تو منڈیر کے اُس طرف ایک دُبلی پتلی ناگن سی لڑکی سفید ڈرین پائپ اور نیبو کے رنگ کا سلیولیس بلاؤز پہنے اپنے میریلین منرو کی طرح کٹے

ہوئے بالوں میں پتلی پتلی انگلیاں پھیر کر کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی، اور پھر ہم سب ہنسنے لگے۔

بھابی پاپڑوں کی پلیٹ لئے اندر سے نکلی اور بغیر پوچھے گچھے یہ سمجھ کر ہنسنے لگی۔ کہ ضرور کوئی ہنسی کی بات ہوئی ہوگی۔ اُس کا ڈھیلا ڈھالا پیٹ ہنسنے میں پھُدکنے لگا۔

اور جب اُسے معلوم ہوا کہ بھیا نے شبنم کو لونڈا سمجھ کر اُس کے بال پکڑ لئے تو وہ اور بھی زور زور سے قہقہے لگانے لگی کہ کئی پاپڑ کے ٹکڑے گھاس پر بکھر گئے۔ شبنم نے بتایا وہ اُسی دن اپنے چچا خالد جمیل کے ہاں آئی ہے۔ اکیلے جی گھبرایا تو فٹ بال ہی لڑھکانے لگی جو قسمت سے بھیا جی کی پیالی پر آن کودی۔

شبنم بھیا کو اپنی تیکھی مسکارہ لگی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ بھیا مسحور سنائے میں اُسے تک رہے تھے۔ ایک کرنٹ اُن دونوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔ بھابی اس کرنٹ سے کٹی ہوئی جیسے کوسوں دور کھڑی تھی اس کا پھُدکتا ہوا پیٹ سہم کر رُک گیا۔ ہنسی نے اُس کے ہونٹوں پر لڑکھڑا کر دم توڑ دیا۔ اُس کے ہاتھ ڈھیلے ہو گئے۔ پلیٹ ٹیڑھی ہو کر پاپڑ گھاس پر گرنے لگے۔ پھر ایک دم وہ دونوں جاگ پڑے اور خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔

شبنم پھُدک کر منڈیر پہ چڑھ گئی۔

"آئیے چائے پی لیجئے۔" میں نے ٹھہری ہوئی فضا کو دھکا دے کر آگے کھسکایا۔

ایک لچک کے ساتھ شبنم نے اپنے پیر منڈیر کے اُس پار سے اس پار جھلائے۔

سفید چھوٹے چھوٹے مکاسن ہری گھاس پہ فاختہ کے جوڑے کی طرح ٹھمکنے لگے۔

شبنم کا رنگ پگھلے ہوئے سونے کی طرح لَو دے رہا تھا۔ اُس کے بال سیاہ بھونرا تھے۔ مگر آنکھیں جیسے سیاہ کٹوریوں میں کسی نے شہد بھر دیا ہو۔ نیبو کے رنگ کے بلاؤز کا گلا بہت گہرا تھا۔ ہونٹ زیتونی رنگ کے اور اُسی رنگ کی نیل پالش لگائے وہ بالکل کسی امریکی اشتہار کا موڈل معلوم ہو رہی تھی۔ بھابی سے کوئی فٹ بھر لانبی لگ رہی تھی حالانکہ مشکل سے دو ایک برس چھوٹی ہو گی۔ اُس کی ہڈی بڑی نازک تھی اس لئے کمر تو ایسی کہ چھلے میں پرو لو۔

بھیا کچھ گم سم سے بیٹھے تھے۔ بھابی اُنھیں ایسے تاک رہی تھی جیسے بلی پر تولتے ہوئے پرندے کو گھورتی ہے کہ جیسے ہی پر پھڑپھڑائے بڑھ کر دبوچ لے۔ اس

daastanikutub.blogspot.com

کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔

اتنے میں منا اُچک کر اُس کی پیٹھ پر دھم سے کودا۔ وہ ہمیشہ اُس کی پیٹھ پر ایسے کودا کرتا تھا جیسے وہ کوئی گدگدا سا تکیہ ہو۔ بھابی ہمیشہ ہی ہنس دیا کرتی تھی۔ مگر آج اُس نے چٹاخ پٹاخ دو چار چانٹے جڑ دیئے۔

شبنم پریشان ہو گئی۔

"ارے ارے ــــ روکئے نا ــــ" اُس نے بھیّا کا ہاتھ چھو کر کہا۔

"بڑی غصہ ور ہیں آپ کی ممی ــ" اُس نے میری طرف منہ پھیر کر کہا۔ انٹروڈکشن ہماری سوسائٹی میں بہت کم ہوا کرتا ہے اور پھر بھابی کا کسی سے انٹروڈکشن کرانا عجیب سا لگتا تھا۔ وہ تو صورت سے ہی گھر کی بہو لگتی تھی۔ شبنم کی بات پر ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ بھابی منّے کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"ارے یہ تو ہماری بھابی ہے" میں نے بھابی کو دھم دھم جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"بھابی؟" شبنم حیرت زدہ ہو کر بولی۔

"ان کی بھیّا کی بیوی"

"اوہ ــــ" اُس نے سنجیدگی سے اپنی نظریں جھکا لیں۔ "میں ــ میں سمجھی!" اُس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"بھابی کی عمر تئیس سال ہے" میں نے وضاحت کی۔

"مگر . . . ڈُدتنٹلی سی ــــ" شبنم ہنسی ــــ بھیّا بھی اُٹھ کر چل دیئے۔

"خدا کی قسم"

"اوہ ــــ جہالت ــــ"

"نہیں ــــ بھابی نے مارٹینز سے پندرہ سال کی عمر میں سینئر کیمبرج کیا تھا"

"تمہارا مطلب ہے ــ یہ مجھ سے تین سال چھوٹی ہیں ــ میں چھبیس سال کی ہوں"

"تب تو قطعی چھوٹی ہیں"

"اُف، اور میں سمجھی وہ تمہاری ممی ہیں۔ دراصل میری آنکھیں ذرا کمزور ہیں۔ مگر مجھے عینک سے نفرت ہے۔ بُرا لگا ہو گا اُنھیں"

"نہیں ــــ بھابی کو کچھ بُرا نہیں لگتا"

"چہ ــ بیچاری"

"کون ــــ بھابی" نا جانے میں نے کیوں کہا۔

"بھیّا اپنی بیوی پر جان دیتے ہیں" صفیہ نے بطور وکیل کہا۔

"بیچارے کی بہت بچپن میں شادی کر دی گئی ہو گی"

"پچیس چھبیس سال کے تھے۔

"مگر مجھے تو معلوم ہی نہ تھا کہ بیسویں صدی میں بھی بغیر دیکھے شادیاں ہوتی ہیں" شبنم نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔

"تمہارا اندازہ غلط نکل رہا ہے . . . . بھیّا نے بھابی کو دیکھ کر بے حد پسند کر لیا تھا۔ تب شادی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ کنول کے پھول جیسی نازک اور حسین تھیں"

"پھر یہ کیا ہو گیا شادی کے بعد؟"

"ہونا کیا ــــ بھابی اپنے گھر کی ملکہ ہیں۔ بچوں کی ملکہ ہیں کوئی فلم ایکٹریس تو ہیں نہیں۔ اور پھر بھیّا کو سوکھی ماری لڑکیوں سے گھن آتی ہے" میں نے جان کر شبنم پر چوٹ کی۔ وہ بے وقوف نہ تھی۔

"بھئی چاہے مجھ سے کوئی پیار کرے یا نہ کرے۔ میں تو کسی کو خوش کرنے کیلئے ہاتھی کا بچہ کبھی نہ ہوں ــــ اوہ معاف کرنا تمہاری بھابی کبھی بہت خوب صورت ہونگی۔ مگر اب تو . . . ."

"اُنھہ، آپ کا نکتۂ نظر بھیّا سے بالکل مختلف ہے" میں نے بات ٹال دی۔ اور جب وہ بل کھاتی سیدھی سڈول ٹانگوں کو آگے پیچھے جھلاتی ننھے ننھے قدم رکھتی

qasarulkutub.blogspot.com

منڈیر کی طرف جا رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں کھڑے تھے۔ اُن کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اور بار بار اپنی آنکھیں سہلا رہے تھے۔ جیسے کسی نے وہاں جلتی جلتی آگ رکھ دی ہو۔ چیتا کی طرح پھدک کر وہ منڈیر پہ پھلانگ گئی۔ پل بھر کو پلٹ کر اُس نے اپنی شربتی آنکھوں سے بھیا کو تولا اور چھلاوے کی طرح کوٹھی میں غائب ہو گئی۔

بھابی لان پر جھکی ہوئی پیالیاں سمیٹ رہی تھی۔ مگر اُس نے ایک نظر نہ آنے والا تار دیکھ لیا۔ جو بھیا جی اور شبنم کی نگاہوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔

ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ شبنم پھولا ہوا لال اسکرٹ اور سفید کھلے گلے کا بلاؤز پہنے بیو کے ساتھ سمبا ناچ رہی تھی۔ اُس کا ننھا سا پکنیز کتا ٹانگوں میں اُلجھ رہا تھا۔ وہ اونچے اونچے قہقہے لگا رہی تھی۔ اُس کی سڈول سانولی ٹانگیں ہری ہری گھاس پر تھرک رہی تھیں۔ سیاہ ریشمی بال ہوا میں چھلک رہے تھے۔ پانچ سال کا بیو بندر کی طرح پھدک رہا تھا۔ مگر وہ نشیلی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اُس نے ناچتے ناچتے ناک پر انگوٹھا رکھ کر مجھے چڑایا۔ میں نے جواب میں گھونسا دکھا دیا۔ مگر فوراً ہی مجھے اُس کی نگاہوں کا پیچھا کر کے معلوم ہوا یہ اشارہ وہ میری طرف نہیں کر رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں احمقوں کی طرح کھڑے گُدّی سہلا رہے تھے۔ اور وہ اُنھیں منہ چڑا کر جلا رہی تھی۔ اُس کی کمر میں بل پڑ رہے تھے۔ کولھے مٹک رہے تھے۔ باہیں تھرتھرا رہی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے جدا لرز رہے تھے۔ اُس نے سانپ کی طرح لپ سے زبان نکال کر اپنے ہونٹ کو چاٹا۔ بھیا کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا ــــ بھابی گودام میں اناج تلوا کر باورچی کو دے رہی تھی۔

"شبنم کی بچی ــــ" میں نے دل میں سوچا ــــ مگر غصّہ مجھے بھیا پر بھی آیا۔ اُنھیں دانت نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُنھیں تو شبنم جیسی کرنیٹوں سے نفرت تھی۔ اُنھیں تو انگریزی ناچوں سے گھن آتی تھی۔ پھر وہ کیوں کھڑے اُسے تک رہے تھے اور ایسی بھی کیا بے سُدھی کہ اُن کا جسم سمبا کی تال پر لرز رہا تھا۔ اور انھیں خبر نہ تھی۔

اتنے میں بوائے چائے کی ٹرے لے کر لان پر آ گیا ــــ بھیا نے ہم سب کو آواز دی۔ اور بوائے سے کہا بھابی کو بھیج دے۔

رسماً شبنم کو بلاوا بھیجنا پڑا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا قطعی اُس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاؤں مگر جب وہ منّے کو گُدّی پر بٹھائے منڈیر پھلانگ کر آئی تو نہ جانے کیوں مجھے وہ قطعی معصوم لگی۔ منّا اُس کا رف لگاموں کی طرح تھامے ہوئے تھا اور وہ گھوڑے کی چال اچھلتی ہوئی لان پر دوڑ رہی تھی۔ بھیا نے منّے کو اُس کی پیٹھ سے اُتارنا چاہا۔ مگر وہ اور چمٹ گیا۔

"ابھی اور گھوڑا چلے آنٹی"

"نہیں بابا ــــ آنٹی میں دم نہیں ــــ" شبنم چلّائی۔ بڑی مشکل سے منّے کو بھیا نے اتارا۔ منّہ پر ایک چانٹا لگایا ایک دم تڑپ کر شبنم نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور بھیا کے ہاتھ پر زور کا تھپڑ لگایا۔

"شرم نہیں آتی ــــ اتنے بڑے اونٹ کے اونٹ ذرا سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہیں" بھابی کو آتا دیکھ کر اُس نے منّے کو اُن کی گود میں دے دیا۔ اُس کا چانٹا کھا کر بھیا مسکرا رہے تھے۔

"دیکھیے تو کتنی زور سے تھپڑ مارا ہے۔ میرے بچّے کو کوئی مارتا تو ہاتھ توڑ کر رکھ دیتی" اُس نے شربت کی کٹوریوں میں زہر گھول کر بھیا کو دیکھا۔ "اور پھر ہنس رہے ہیں بے حیا!"

"ہوں۔ دم بھی ہے ــــ جو ہاتھ توڑو گی ــــ" بھیا نے اُس کی کلائی مروڑی۔ وہ بل کھا کر اتنی زور سے چیخی کہ بھیا نے لرز کر اُسے چھوڑ دیا۔ اور وہ ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ گئی۔ چائے کے درمیان بھی شبنم کی شرارتیں چلتی رہیں۔ وہ بالکل کمسن چھوکریوں کی طرح چہلیں کر رہی تھی۔ بھابی گُم سُم بیٹھی تھیں۔ آپ سمجھے ہوں گے۔ شبنم کے وجود سے ڈر کر اُنھوں نے اپنی طرف توجہ بھی شروع کر دی ہو گی۔ جی قطعی نہیں۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ موٹی لگنے لگیں۔ پہلے سے بھی زیادہ کھاتیں۔ ہم سب تو ہنس زیادہ رہے تھے۔ مگر وہ سر جھکائے نہایت انہماک

dasarulkutub.blogspot.com

سے کیک اُڑا رہے تھے۔ بس مصروف تھیں۔ چٹنی لگا لگا کر بھجیے نگل رہی تھیں پکے ہوئے توسوں پر ڈھیر سا مکھن اور جیلی تھوپ تھوپ کر دے کھائے جا رہی تھیں۔ بھیّا اور شبنم کو دیکھ دیکھ کر ہم سب ہی پریشان تھے اور شاید بھابی بھی فکرمند ہو گی مگر وہ اپنی پریشانی کو مرغن کھانوں میں دفن کر رہی تھیں۔ اُنھیں ہر وقت کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں مگر وہ چورن کھا کھا کر پُلاؤ قورمہ ہضم کرتیں۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے بھیّا جی اور شبنم کو ہنستا بولتا دیکھتیں۔ بھیّا تو کچھ اور بھی لونڈے سے لگنے لگے تھے۔ شبنم کے ساتھ وہ صبح و شام سمندر میں تیرتے۔ بھابی اچھا بھلا تیرنا جانتی تھیں۔ مگر بھیّا کو سوئمنگ سوٹ پہنی عورتوں سے بہت نفرت تھی۔ ایک دن ہم سب سمندر میں نہا رہے تھے۔ شبنم ننھی ننھی دو دھجیاں پہنے ناگن کی طرح پانی میں بل کھا رہی تھی۔

اتنے میں بھابی جو دیر سے منّے کو پکار رہی تھیں، آگئیں۔ بھیّا شرارت کے موڈ میں تو تھے ہی، دوڑ کر اُنھیں پکڑ لیا اور ہم سب نے مل کر اُنھیں پانی میں گھسیٹ لیا جب سے شبنم آئی تھی۔ بھیّا بہت شریر ہو گئے تھے۔ ایک دم سے وہ دانت کچکچا کر بھابی کو ہم سب کے سامنے بھینچ لیتے۔ اُنھیں گود میں اُٹھانے کی کوشش کرتے۔ مگر وہ اُن کے ہاتھوں میں سے بوبل مچھلی کی طرح پھسل جاتیں۔ پھر وہ کھسیا کر رہ جاتے۔ جیسے تخیل میں وہ شبنم ہی کو اُٹھا رہے تھے۔ اور بھابی کسی گائے کی طرح نادم ہو کر فوراً پڈنگ یا کوئی اور مزے دار ڈش تیار کرنے چلی جاتیں اُس وقت جو اُنھیں پانی میں ڈھکیلا گیا۔ تو وہ گٹھڑی کی طرح لڑھک گئیں۔ اُن کے کپڑے جسم پر چپک گئے اور اُن کے جسم کا سارا بھونڈا پن بھیانک طریقہ پر اُبھر آیا۔ کمر پر جیسے کسی نے توشک لپیٹ دی تھی۔ کپڑوں میں وہ اتنی بھیانک نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

"اُفوہ کتنی موٹی ہو گئی ہو تم!" بھیّا نے اُن کے کولھے کا بوٹا پکڑ کر کہا۔ "اُف تونَد تو دیکھو ـــــ بالکل گاما پہلوان معلوم ہو رہی ہو!"

"ہُنہہ چار بچے ہونے کے بعد کمر ـــــ"

"میرے تو چار بچے ہیں ـــــ میری کمر تو ڈنلو پلو کا گدا نہیں بنی!" اُنھوں نے اپنے سڈول جسم کو ٹھوک بجا کر کہا۔ اور بھابی مُنہ تھوتھائے بھیگی مُرغی کی طرح پیر مارتی

چھُرچھُریاں لیتی ریت میں گہرے گہرے گڈھے بناتی منّے کو گھسیٹتی چلی گئیں۔ بھیّا بالکل بے توجہ ہو کر شبنم کو پانی میں ڈبکیاں دینے لگے۔ مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی، ایسا اڑنگا لگایا کہ غڑاپ سے اوندھے مُنہ گر پڑے۔

جب نہا کر آئے تو بھابی سر جھکائے خوبانیوں کے مربّہ پر کریم کی تہہ جما رہی تھیں، اُن کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے اور آنکھیں سُرخ تھیں۔ گٹّا رجیہ کی گڑیا جیسے موٹے موٹے گال کچھ اور سوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

لنچ پر بھابی بے انتہا غمگین تھیں۔ لہٰذا بڑی تیزی سے خوبانیوں کا مربّہ اور کریم کھانے پر جُٹی ہوئی تھیں۔ شبنم نے ڈش کی طرف دیکھ کر ایسے پھریری لی جیسے خوبانیاں نہ ہوں سانپ بچھو ہوں۔

"زہر ہے زہر!" اُس نے نفاست سے لکڑی کا ٹکڑا کُترتے ہوئے کہا۔ اور بھیّا بھابی کو گھورنے لگے۔ مگر وہ شپا شپ مربّہ اُڑاتی رہیں۔

"حد ہے!" اُنھوں نے نتھنے پھڑکا کر کہا۔

بھابی نے کوئی دھیان نہ دیا۔ اور قریب قریب پوری ڈش پیٹ میں انڈیل لی۔ اُنھیں مربّہ سپوڑتے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ رشک و حسد کے طوفان کو روکنے کے لیے بند باندھ رہی ہوں۔ یہ کریم چربی کی چٹانوں کی صورت میں اُن کے جسم کے قلعے کو ناقابل تسخیر بنا دے گی۔ پھر شاید دل میں یوں ٹیسیں نہ اُٹھیں گی۔ بھیّا جی اور شبنم کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ٹکراؤ سے بھڑکنے والے شعلے ان پتھریلی دیواروں کو نہ پگھلا سکیں گے۔

"خدا کے لیے بس کرو ـــــ ڈاکٹر بھی منع کر چکا ہے ایسا بھی کیا چٹورپن!"

بھیّا نے کہہ ہی دیا۔ موم کی دیوار ... بھابی پگھل گئیں۔ بھیّا کا نشتر چربی کی تہوں کو چیرتا ہوا ٹھیک دل میں اُتر گیا۔ موٹے موٹے آنسو بھابی کے پھولے ہوئے گالوں پر پھسلنے لگے۔ سسکیوں نے جسم کے ڈھیر میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ وہ پتلی نازک لڑکیاں کس لطیف اور سہانے انداز میں روتی ہیں۔ مگر بھابی کو روتے دیکھ کر بجائے دُکھ کے ہنسی آتی تھی جیسے کوئی روئی کے بھیگے ہوئے ڈھیر کو ڈنڈوں سے پیٹ رہا ہو۔

دم [illegible] بوکھلی ہوئی اُٹھنے لگیں مگر ہم لوگوں نے روک لیا۔ اور بھیّا کو ڈانٹا خوشامد کر کے واپس اُنھیں بٹھا لیا۔ بیچاری ناک سُڑکاتی بیٹھ گئیں مگر جب انھوں نے کافی میں چینی ڈال کر کمرے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک دم ٹھٹک گئیں۔ سہمی ہوئی نظروں سے شبنم اور بھیّا کی طرف دیکھا۔ شبنم بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھی بھیّا مارے غصّے کے روہانسے ہو رہے تھے۔ وہ ایک دم بھنّا کر اُٹھے اور جا کر برآمدے میں بیٹھ گئے۔ اُس کے بعد حالات اور بگڑے۔ بھابی نے کھُلّم کھُلّا اعلانِ جنگ کر دیا۔ کسی زمانے میں بھابی کا پٹھانی خون بہت گرم تھا۔ ذرا سی بات پر ہاتھا پائی پر اُتر آیا کرتی تھیں اور بارہا بھیّا سے خفا ہو کر بجائے منہ پھلانے کے وہ خونخوار بلّی کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑتیں اُن کا منہ کھسوٹ ڈالتیں۔ دانتوں سے گریبان کی دھجیاں اڑا دیتیں۔ پھر بھیّا اُنھیں اپنی ہی بانہوں میں جکڑ کر بے بس کر دیتے اور وہ اُن کے سینے سے لگ کر پیاسی ڈری ہوئی چڑیا کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتیں۔ پھر ملاپ ہو جاتا اور جھینپی کھسیانی وہ بھیّا کے منہ پر لگے ہوئے کھرونچوں پر پیار سے ٹنکچر لگا دیتیں۔ اُن کے گریبان کو رفو کرتیں اور بیٹھی بیٹھی شکر گزار آنکھوں سے اُنھیں تکتی رہتیں۔

یہ تب کی بات ہے جب بھابی ہلکی پھلکی تیتری کی طرح طرار تھیں اُڑتی ہوئی چھوٹی سی بلّی سی معلوم ہوتی تھیں۔ بھیّا کو اُن پر غصّہ آنے کے بجائے اور شدت سے پیار آتا مگر جب سے اُن پر گوشت نے جہاد بول دیا تھا وہ بہت ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ اُنھیں اوّل تو غصّہ ہی نہ آتا۔ اور اگر آتا بھی تو فوراً اِدھر اُدھر کام میں لگ کر بھول جاتیں۔

اُس دن اُنھوں نے اپنے بھاری بھرکم ڈیل کو بھول کر بھیّا پر حملہ کر دیا۔ بھیّا صرف اُن کے بوجھ سے دھکا کھا کر دیوار سے جا چپکے۔ رضائی کے گٹھر کو یوں لڑھکتے دیکھ کر اُنھیں سخت گھِن آئی۔ نہ غصّہ ہوئے۔ نہ بگڑے۔ شرمندہ اُداس سر جھکائے کمرے سے نکل بھاگے۔ بھابی وہیں پسر کر رونے لگیں۔

بات اور بڑھی اور ایک دن بھیّا کے سالے آ کر بھابی کو لے گئے۔ طفیل بھابی کے چچازاد بھائی تھے۔ اُنھیں دیکھ کر وہ بچّوں کی طرح اُن سے لپٹ کر رونے لگیں۔ اُنھوں نے بھابی کو پانچ سال بعد دیکھا تھا۔ وہ گول گنبد کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لئے

سٹ پٹائے۔ پھر اُنھوں نے بھابی کو ننھی بچّی کی طرح سینے سے لگا لیا۔ بھیّا اُس وقت شبنم کے ساتھ کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ طفیل نے شام تک اُن کا انتظار کیا۔ وہ نہ آئے تو مجبوراً بھابی اور بچّوں کا سامان تیار کیا گیا۔

جانے سے پہلے بھیّا گھڑی بھر کو کھڑے کھڑے آئے۔

"دہلی کے مکان میں نے اُن کے مہر میں دے دئیے" اُنھوں نے رُکھائی سے طفیل سے کہا۔

"مہر؟" بھابی تھر تھر کانپنے لگی۔

"ہاں ——— طلاق کے کاغذات وکیل کے ذریعے پہنچ جائیں گے۔"

"مگر طلاق ——— طلاق کا کیا ذکر ہے ———؟"

"اسی میں بہتری ہے۔"

"مگر ——— بچّے ———؟"

"یہ چاہیں تو اُنھیں لے جائیں ——— ورنہ میں نے بورڈنگ میں انتظام کر لیا ہے۔"

ایک چیخ مار کر بھابی بھیّا پر جھپٹیں ——— مگر اُنھیں کھسوٹنے کی ہمت نہ پڑی سہم کر ٹھٹک گئیں۔

اور پھر بھابی نے اپنی نسوانیت کی پوری طرح بے آبروئی کر ڈالی۔ وہ بھیّا کے پیروں پر لوٹ گئیں۔ ناک رگڑ ڈالی۔

"تم اُس سے شادی کر لو ——— میں کچھ نہ کہوں گی۔ مگر خدا کے لئے مجھے طلاق نہ دو۔ میں یوں ہی زندگی گزار دوں گی۔ مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی۔"

مگر بھیّا نے نفرت سے بھابی کے تھل تھل کرتے ہوئے جسم کو دیکھا۔ اور منہ موڑ لیا۔

"میں طلاق دے چکا۔ اب ——— کیا ہو سکتا ہے۔"

مگر بھابی کو کون سمجھاتا۔ وہ بلبلائے چلی گئیں۔

"بے وقوف ———" طفیل نے ایک ہی جھٹکے میں بھابی کو زمین سے اُٹھا لیا

qasarulkutub.blogspot.com

"ارے نکڑ چھی کہیں کی" اچھل اُٹھا "بس" اور وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

کیا دردناک سماں تھا۔ بچے پھوٹ پھوٹ کر روتے میں بھابی کا ساتھ دے رہے تھے۔ امّاں خاموش ایک ایک کا مُنہ تک رہی تھیں۔ ابّا کی موت کے بعد اُن کی گھر میں کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ بھیّا خود مختار تھے بلکہ ہم سب کے سرپرست تھے۔

امّاں اُنھیں بہت سمجھا کر ہار گئی تھیں۔ اُنھیں اس دن کی اچھی طرح خبر تھی۔ مگر کیا کر سکتی تھیں۔

بھابھی چلی گئیں —— فضا ایسی خراب ہو گئی تھی کہ بھیّا اور شبنم بھی شادی کے بعد ہل اسٹیشن پر چلے گئے۔

سات آٹھ سال گزر گئے کچھ کم و بیش ٹھیک اندازہ نہیں۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں کی ہو گئیں۔ امّاں کا انتقال ہو گیا۔ ابّا کی موت کے بعد وہ بالکل گُم سُم ہو کر رہ گئی تھیں۔ اُنھوں نے بھابی کی طلاق پر بہت رونا پیٹنا مچایا، مگر بھیّا کے مزاج سے وہ واقف تھیں۔ وہ کبھی ابّا کی بھی نہیں سُنتے تھے۔ کماؤ پوت اپنا آپ مالک ہوتا ہے۔

آشیانہ اُجڑ گیا۔ بھرا پُرا گھر سنسان ہو گیا۔ سب اِدھر اُدھر اُڑ گئے سات آٹھ سال آنکھ جھپکتے نہ جانے کہاں گُم ہو گئے۔ کبھی سال دو سال میں بھیّا کی کوئی خیر خبر مل جاتی۔ وہ زیادہ تر ہندوستان سے باہر ملکوں کی چک پھیریوں میں اُلجھے رہتے۔ مگر جب اُن کا خط آیا کہ وہ بمبئی آ رہے ہیں تو بھولا بسرا بچپن پھر سے جاگ اُٹھا۔

بھیّا جی ٹرین سے اُترے تو ہم دونوں بچوں کی طرح لپٹ گئے۔ شبنم مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ اُن کا سامان اُتر رہا تھا۔ جیسے ہی بھیّا سے اُس کی خیریت پوچھنے کو مُڑی، دھپ سے ایک وزنی ہاتھ میری پیٹھ پر پڑا۔ اور کئی من کا گرم گرم گوشت کا پہاڑ مجھ سے لپٹ گیا۔

"بھابی!" میں نے پلیٹ فارم سے نیچے گرنے سے بچنے کیلئے کھڑکی میں جھول کر کہا۔ زندگی میں میں نے شبنم کو کبھی بھابی نہ کہا تھا۔ وہ لگتی بھی تو شبنم ہی تھی مگر آج میرے منہ سے بے اختیار بھابی نکل گیا۔ شبنم کی پھوار —— ان چند سالوں میں گوشت اور پوست کا تھودا کیسے بن گئی؟ میں نے بھیّا کی طرف دیکھا وہ ویسے ہی دراز قد اور چھریرے تھے ایک تولہ گوشت اِدھر نہ اُدھر وہی کمسن لڑکوں جیسے گھنے بال۔ بس دو چار سفید چاندی کے تار کنپٹیوں پر جھانکنے لگے تھے جن سے وہ اور بھی حسین اور باوقار معلوم ہونے لگے تھے۔ ویسے کے ویسے چٹان کی طرح جمے ہوئے تھے۔ لہریں تڑپ تڑپ کر چٹان کی اور لپکتی ہیں، اپنا سر اُس کے قدموں میں دے مارتی ہیں —— پاش پاش ہو کر بکھر جاتی ہیں۔ معدوم ہو جاتی ہیں۔ ہار تھک کر واپس لوٹ جاتی ہیں۔ کچھ وہیں اُس کے قدموں میں دم توڑ دیتی ہیں اور نئی لہریں پھر سر فروشی کے ارادے سمیٹے چٹان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

اور چٹان —— ان سجدوں سے دور —— طنز سے مسکراتا رہتا ہے۔

اٹل، لاپرواہ اور بے رحم! جب بھیّا نے شبنم سے شادی کی تو سب ہی نے کہا تھا —— شبنم آزاد لڑکی ہے، بچّی عمر کی ہے —— بھابی —— تو بہ میں نے شہناز کو ہمیشہ بھابی ہی کہا۔ ہاں تو شہناز بھولی اور کم سن تھی —— بھیّا کے قابو میں آ گئی۔ یہ ناگن اُنھیں ڈس کر بے سُدھ کر دے گی۔ اُنھیں مزہ چکھائے گی۔

مگر ان بیچاروں کو صرف چٹان ہی چکھا سکتا ہے۔

"بچے بورڈنگ میں ہیں چھٹی نہیں تھی۔ اُن کی ——" شبنم نے کھٹی ڈکار دل بھری سانس میری گردن پر چھوڑ کر کہا۔

اور میں حیرت سے اُس گوشت کے ڈھیر میں اس شبنم کی پھوار کو ڈھونڈھ رہی تھی جس نے شہناز کے پیار کی آگ کو بجھا کر بھیا کے کلیجے میں نئی آگ بھڑکا دی تھی، مگر یہ کیا؟ بجائے اُس آگ میں بھسم ہو جانے کے بھیّا تو اور بھی سونے کی طرح تپ کر نکھر آئے تھے۔ آگ خود اپنی تپش میں بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن گئی تھی۔ بھابی تو کھولتا ہوا تیل کا جوہڑ تھی —— مگر شبنم تو جھلسی ہوئی مٹیالی راکھ تھی —— اُس کا سانولا کندنی رنگ مری ہوئی

qasarulkutub.blogspot.com

چھپکلی کے پیٹ کی طرح اور زرد ہو چکا تھا۔ وہ شربت گھلی ہوئی آنکھیں گدلی اور بے رونق ہو گئی تھیں۔ پتلی ناگن جیسی لچکتی ہوئی کمر کا کہیں دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ مستقل طور پر حاملہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ نازک نازک چمکیلی شاخوں جیسی بانہیں مگدر کی طرح گاؤدم ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ پوڈر تھپا ہوا تھا۔ آنکھیں مسکارہ سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ بھنویں شاید غلطی سے زیادہ کھنچ گئی تھیں جبھی تاتی گہری پنسل گھسا پڑی تھی۔

بھیا رٹز میں ٹھہرے۔ رات کو ڈنر پر ہم وہیں پہنچ گئے۔

کیبرے اپنے پورے عروج پر تھا۔ مصری حسینہ اپنے جھاگ جیسے پیٹ کو مروڑیاں دے رہی تھی اس کے کولھے دائروں میں لچک رہے تھے ——— سڈول مرمریں بازو ہوا میں تھرتھرا رہے تھے ——— باریک شفاف میں سے اس کی رو پہلی ٹانگیں ہاتھی دانت کے تراشے ہوئے ستونوں کی طرح پھڑک رہی تھیں ——— بھیا کی بھوکی آنکھیں اس کے جسم پر چھچھوندوں کی طرح رینگ رہی تھیں ———

وہ بار بار اپنی گدھی پر انجانی چوٹ سہلا رہے تھے۔

بھابی ——— جو کبھی شبنم تھی ——— مصری رقاصہ کی طرح لہراتی ہوئی بجلی تھی۔

جو ایک دن بھیا کے حواس پر گری تھی آج ریت کے تودے کی طرح بھسکی بیٹھی تھی۔ اس کے موٹے موٹے گال خون کی کمی اور مستقل بدہضمی کی وجہ سے تمی کی طرح زردی مائل سبز ہو رہے تھے۔ نیان لائٹس کی روشنی میں اس کا رنگ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی انجلتے ناگ نے اسے ڈس لیا ہو۔ مصری رقاصہ کے کولھے طوفان برپا کر رہے تھے۔ اور بھیا جی کے دل کی ناؤ اس بھنور میں چکر پھیریاں کھا رہی تھی، پانچ بچوں کی ماں شبنم ——— جو اب بھابی بن چکی تھی، سہمی سہمی نظروں سے انھیں تک رہی تھی۔ دھیان بٹانے کے لئے وہ تیزی سے بھنا ہوا مرغ ہڑپ کر رہی تھی۔

آرکسٹرا نے ایک بھرپور سانس کھینچی ——— ساز کراہے ——— ڈرم کا دل گونج اٹھا۔ مصری رقاصہ کی کمر نے آخری جھکولے لئے اور نڈھال ہو کر مرمریں فرش پر پھیل گئی ———

ہال تالیوں سے گونج رہا تھا ——— شبنم کی آنکھیں بھیا جی کو ڈھونڈھ رہی تھیں ——— بیرا تر و تازہ راسبری اور کریم کا جگ لے آیا۔ بے خیالی میں شبنم نے پیالہ راسبریوں سے بھر لیا ——— اس کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ آنکھیں چوٹ کھائی ہوئی ہرنیوں کی طرح پریشان چوکڑیاں بھر رہی تھیں۔

بھیڑ بھاڑ سے دور ——— نیم تاریک بالکنی میں بھیا کھڑے مصری رقاصہ کا سگریٹ سلگا رہے تھے۔ ان کی پر شوق نگاہیں رقاصہ کی نشیلی آنکھوں سے الجھ رہی تھیں۔

شبنم کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ ایک بے ہنگم پہاڑ کی طرح گم سم بیٹھی تھی۔ شبنم کو اپنی طرف تکتا دیکھ کر بھیا رقاصہ کا بازو تھامے اپنی میز کی طرف لوٹ آئے۔ اور ہمارا تعارف کرایا۔

"میری بہن" انھوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ رقاصہ نے لچک کر میرے وجود کو مان لیا۔

"میری بیگم" انہوں نے ڈرامائی انداز میں کہا . . . جیسے کوئی میدان جنگ میں کھایا ہوا زخم کسی کو دکھا رہا ہو۔ رقاصہ دم بخود رہ گئی۔ جیسے اس نے ان کی رفیقۂ حیات کو نہیں خود ان کی لاش کو خون میں غلطاں دیکھ لیا ہو، وہ ہیبت زدہ ہو کر شبنم کو گھورنے لگی۔ پھر اس نے اپنے کلیجے کی ساری ممتا اپنی آنکھوں میں سمو کر بھیا کی طرف دیکھا اس ایک نظر میں لاکھوں فسانے پوشیدہ تھے۔ "اف یہ ہندوستان جہاں جہالت سے کیسی کیسی پیاری ہستیاں رسم و رواج پر قربان کی جاتی ہیں۔ قابل پرستش ہیں وہ لوگ اور قابل رحم بھی جو ایسی ایسی "سزائیں" بھگتتے ہیں"۔

"شبنم میری بھابی نے رقاصہ کی نگاہوں میں یہ سب کچھ پڑھ لیا۔ اس کے ہاتھ لرزنے لگے۔ پریشانی چھپانے کے لئے اس نے کریم کا جگ اٹھا کر بھریوں پر انڈیل دیا اور جھینپ گئی۔

بیچارے بھیا جی! ہینڈسم اور مظلوم ——— سورج دیوتا کی طرح حسین اور رنگین شہد بھری آنکھوں والے بھیا جی جیالوں کی طرح اٹل ——— ایک امر شہید کا روپ سجائے بیٹھے مسکرا رہے تھے۔

ایک لہر چور چور ان کے قدموں میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔

دوسری نئی نویلی لچکتی ہوئی لہر ان کی پتھریلی باہوں میں سمانے کے لئے بے چین اور بے قرار تھی!

qasarulkutub.blogspot.com

"عشق پر زور نہیں ......"

"اے آپا، کچھ سندرا" وہاب چچا کی دُلہن کی ناک کے غدود پھول گئے تھے۔ میں نے ان کی ناک سے خون نکلتے نہیں سُنا۔ وہ بعد بعد کرتی بڑے آپا والی ڈیوڑھی سے اُتریں۔ اُن کی گود میں اُن کا دسواں یا رھواں استقاط تھا۔ ننھے بھائی اُن کے ہر بچے کو استقاط کہا کرتے تھے۔ کیوں کہ جوں ہی اُن کا پیر بھاری ہوتا وہ استقاط کے لئے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیتیں، دور دور کے محلوں کی دائیاں اور مہترانیاں ہار جاتیں اور ٹلوا ہیاؤں ہیاؤں آ ہی جاتا۔ مشکل سے ساڑھے چار فٹ کا قد ہوگا۔ مگر قطر بھی اتنا ہی ہوگا۔ . . . بس گول، جیسے ہوا بھری فٹ بال، پیٹ خالی ہوتا جو کہ بہت ہی تھوڑے وقفے کے لئے ہوا کرتا تھا۔ تب بھی وہی حالت رہتی۔ ایک دو انچ کا فرق تو وہ جیب ڈٹ کر رجیب کے کونڈے کھاتی تھیں۔ جب بھی ہو جاتا تھا۔ سیر کھسکتی وہ دھپ سے آکر بیوی کے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ بیوی اور اُن کی پٹاری چھنک اٹھے۔ ہم اپنی اماں کو نوکروں کی دیکھا دیکھی بیوی ہی کہتے تھے۔

"اے بے موت آئے۔ نگوڑے نے مُوت دیا" وہ لونڈے کو پائینتی پہ

مٹکا کر "شی شی" کرنے لگیں۔ بیوی جل گئیں۔ "کمبخت نے موت دیا تو اُس میں کوسنے کی کونسی بات ہے؟"

"اے ڈبتی ہیں تو اُس کا ذکر کر رہی تھی آپا، خلیفن ڈوبے نے نکاح کر لیا!"

"اوئی . . . خلیفن نے نکاح کر لیا . . . کب؟ . . . کس سے؟" بیوی ناک پر سروتا رکھ کر چونکیں۔

"پچھلی جمعرات کو . . . ممدو میاں سے۔"

"اے خدائی خوار کو یہ بڑھاپے میں کیا جو چھلے بگھارنے کی سوجھی۔"

"اللہ جانڈے" وہاب چچا کی دُلہن نے گریبان کھول کر لونڈے کا دستر خوان لگا دیا۔ اللہ کیا بدن تھا۔ ہم لونڈیاں بالیاں تو شرم سے پانی پانی ہو جایا کرتی تھیں۔ بچوں کے ناشتہ دان تھے کہ مراد آبادی لوٹے۔ پچھلا استقاط تو اسی لوٹے کے نیچے دب کر جاں بحق تسلیم ہو گیا۔ رات کو سوتے میں منہ میں دودھ دیا۔ نہ جانے کیسے نیند میں کروٹ لی کہ منہ اور ناک پر ڈھائی تین سیر گوشت آن پڑا۔ بیچارے کا دم گھٹ گیا مر گیا۔ اُن کا جسم دیکھ کر مجھے خیال آیا کرتا تھا شاعروں کو عورت کے اس حصّہ جسم سے بڑا عشق ہے۔ دیکھیں ایک دفعہ وہاب چچا کی دُلہن کو تو جی بھر جائے۔

خلیفن پینتالیس سال کے پیٹے میں ہونگی۔ خلیفہ کو مرے چار پانچ سال ہو چکے تھے۔ ہندوستان میں شریف عورت اس عمر میں بوڑھی ہو جاتی ہے اور کسی سے دل لگانے کی بجائے خدا سے لو لگاتی ہے۔ کوئی نگوڑی نا ہٹی نہ تھیں۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں چھوٹی بیٹی بکو میرے ساتھ رحمن کوٹ کے مدرسے میں روز تختیوں سے پٹتی جاتی تھی۔ باقری کا رحمن بھائی کے لونڈے الو سے بڑے دھڑلے کا عشق چل رہا تھا۔ کیوں کہ ڈلا کا کردار خاکسار بھی ادا کرتی تھی۔

خلیفن کا سن نکاح کا نہ تھا۔ پھر ممدو میاں اُن سے دو سال چھوٹے ہی ہوں گے۔ بیوی ڈیڑھ سال ہوا جا۔ بچے چھوڑ کر مر گئی تھی۔ نگوڑے ناٹھے رہ گئے تھے کیا دبلو پتلے انسان تھے۔ یہ لمبا قد، چوڑی چھاتی، چیچک رو، سیاہ بھجنگے۔ لکڑی کا دھندا کرتے تھے۔ چھپتے یہ ان کی ٹال تھی۔ خود ماتحتوں میں رہتے تھے۔ کبھی لکڑیوں کی ضرورت ہوتی

qasarulkutub.blogspot.com

خود جھگڑا لے کر آتے تو ڈیوڑھی پر ضرور آتے۔

"آپا پھو... پان دان نہیں دوں گی" وہ زور سے ڈنکارتے۔ محلوں ٹولوں میں سب رشتے دار ہی ہوتے ہیں۔ اماں جنھیں محمد میاں کی ہاتھی جیسی چنگھاڑ سے دل کا دورہ پڑنے لگتا تھا۔ جلدی سے پان لگا، پاندان کے ڈھکنے پر رکھ کر بھجوا دیتیں، محمد بھائی خاصدان میں پان لگ کر جانے والی حیثیت کے آدمی نہیں تھے۔ اُن کی بیوی جب زندہ تھیں، آتیں تو پلنگ کی ادوان پر ٹکا بیٹھتیں۔ وہ باپ چچا کی دُلہن وصپ سے ہر جگہ بیٹھنے کا حق رکھتی تھیں۔

علیم الدین، کلیم الدین دو بیٹے ریلوے میں گڈس کلرک تھے۔ بڑی بیٹی زینب ہمارے ہی محلّے میں یعنی پنجہ شاہی پر رہتی تھیں۔ اُن کے میاں گنڈے کا کام کرتے تھے۔

چھوٹی کا میاں فیض آباد میں تھانے دار تھا۔ وہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ خلیفہ نے اُنھیں کسی کا محتاج نہیں چھوڑا تھا۔ اپنا مکان تھا۔ دو کوٹھریاں اور کھپریل، گھر بیٹھے بٹھائے نیک بخت کو کیا مار پڑی کہ جوان جہان بیٹوں بیٹیوں کا مُنہ کالا کرا دیا۔

زینب خالہ نے تو رو رو کر آنکھیں سُجا لیں۔ اُن کی نندوں نے اتنے طعنے دئے کہ کلیجا چھلنی کر دیا۔ اُنھوں نے جل کر پھندن کی منگنی اپنی بڑی نند کی لونڈیا سے توڑ دی۔ پھندن اپنی پھوپی زاد بہن سے بچپن سے منگا ہوا تھا۔

"پھندن کی منگنی ٹوٹ گئی... پھندن کی دُلہن روٹھ گئی... پھندن کی ساس نے منگنی توڑ دی" گلی کے لونڈوں نے وہ نگوڑے کے پیچھے تالی دی کہ اُس نے اسکول جانا چھوڑ دیا۔ دن بھر کنکیاں لوٹا کرتا تھا۔ چھ برس کا پھندن مجنون بن گیا۔

ڈھیلی ڈھالی خلیفن سے کسی کو اُمید نہ تھی کہ یوں بڑھاپے میں خصم کر لیں گی۔ گو سارا چونڈا اجھک ہوتا جا رہا تھا۔ ہاں بتیسی سلامت تھی۔ سفید براق کپڑے پہن کر کبھی تیج تیوہار پر حصّے کی رکابی لئے ہمارے ہاں آتی تھیں۔ کبھی اپنے گھر میں رہتی تھیں۔ بڑی محبت کی آدمی تھیں بات بے بات بچوں کو گھر میں بھرے رہتی تھیں۔ کبھی سنگھاڑے بانٹ رہی ہیں۔ کبھی بیر، کبھی کچھ نہیں تو مٹھی مٹھی چنے ہی بانٹ دیتیں۔ باری باری سب بیٹوں بیٹیوں کے ہاں جا کر رہیں۔ مگر کسی کو اُن کی ضرورت نہ تھی۔ ویسے زبان کی ہمیشہ

سے کڑوی تھیں۔ پر خلیفہ کی موت نے تو زبان کی نوک میں زہر بھر دیا۔ جہاں جاتیں سیہی کا کانٹا بن جاتیں۔ میاں بیوی میں طلاق طلاقی پر نوبت پہنچ جاتی۔ ویسے زینب آپا کی سسرال میں اتنی جگہ بھی نہ تھی کہ خلیفن بھی رہ سکتیں۔ کلیم الدین کی بیوی سے اس لئے نہ بنی کہ وہ ٹھہریں فیشن ایبل۔ اُن کی بچیاں گیّے سے بالوں میں ربن ڈالتیں۔ خلیفن کو ہول اُٹھتی۔ وہ تیل چپڑ کر چٹیاں باندھ دیتیں۔ بہو نے صاف کہہ دیا "یا تو اماں رہیں یا میں" ظاہر ہے کہ اماں کو بوریا بستر اُٹھا کر اپنے گھر لوٹنا پڑا۔ فیض آباد والی کے ہاں جی نہ لگا۔ گھر نوکروں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ذرا ذرا سی بات پر چوریاں پکڑتیں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتیں۔ لازم تو یہ تھا کہ مزے سے دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ اللہ کی یاد میں وقت گزارتیں۔ مگر نہیں خلیفن کو تو کُھجل تھی۔ نچلا بیٹھنا دشوار تھا۔ گھر بھر سارے گھر میں گھستی پھرتیں۔ اِدھر کی چیز اُدھر، ہر جگہ گھر میں تالے، نوکروں نے اُن کے خلاف محاذ بنا لیا۔ زندگی دشوار ہو گئی۔ ویسے میاں بیوی کو اپنی باتوں سے کب فرصت ملتی تھی۔ جو ان سے دو باتیں کر لیتے۔ نہ گھر میں بچہ تھا کہ اُن کا جی بہلتا۔ چھوٹے نے صاف انکار کر دیا۔ "یہاں آپ کو قباحت ہوگی۔ میں خرچہ تو بھیج رہا ہوں پابندی سے" خرچے کی خلیفن کو کمی نہ تھی۔ صرف خرچہ ہی زندگی کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ اُنھیں سجی ہوئی مورتی کی طرح بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔ اچھے خاصے گھر میں کون تھا اب کوڑا کرنے والا پھر بھی جھاڑو دیتیں۔ خلیفہ زندہ تھے تب اتنی تنہائی نہ تھی۔ کتنے کام تھے۔ کیسا بھرا بھرا گھر لگتا تھا۔ ایک دم کی کتنی رونق تھی۔ چھوٹے کی جب تک شادی نہ ہوئی تھی زینت بھی باپ کی لاڈلی تھی۔ ایک خیال جو روز نہ آئے۔ اب مہینے گذر جاتے تھے۔ اُسے اپنے بال بچوں ہی سے فرصت نہ تھی۔ کبھی وہ دن تھے، خلیفن کو نواسوں، پوتوں کی طرف نظر اٹھانے کی فرصت نہ تھی۔ خلیفہ ہی اُن کی گود کا بچہ تھے۔ کئی سال سے چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے۔ خلیفن انھیں بچوں سے زیادہ بنا سنوار کر رکھتیں۔ کرتے کاڑھ کاڑھ کر پہناتیں۔ اُن کے گھٹنوں پر مالش کرتیں۔ حقہ بھر بھر کر دیتیں۔ پچیس سال کا ساتھ تھا۔ خلیفہ اُن کے جسم کا حصّہ بن چکے تھے۔ اُن کے بیمار پڑنے میں کتنا انہاک تھا کہ عبادت کا شبہ ہوتا تھا۔ وہ ایک پل کو اوجھل ہو جاتیں تو خلیفہ بچوں کی طرح بلبلا اُٹھتے۔ مرتے مر گئے

qasrulkutub.blogspot.com

کبھی بچّی سے بیوی کی پلنگڑی جدا نہ کی۔

رات کو خلیفہ اُن سے فارغ کرنے تو وہ نئی نویلی دُلہن کی طرح تنگ کرتیں۔

"اے بڈھے بڑھاپے ہیں یہ چونچلے نہیں بھاتے۔"

"ہوں! کیا سمجھتی ہو، میں اپاہج ہوں تو مرد بھی نہیں رہا!" وہ کروٹ لے کر اُن کے پلنگ پر آ رہتے۔ راتوں کو انگلی پر بیٹھی جازم نان دیا کرتی تھیں۔ جب بڑی بہو بیاہ کر آئیں تو انھیں اپنی جازم کے بارے میں بڑی شرم آتی ہے۔ جوان بیٹا کیا سوچے گا۔ بہو کیا کہے گی۔

بہو مسکرائی "ارے ہمارے اماں ابا تو جاڑ میں نہیں تاپتے۔ یہ تو ابھی تک دلہن دلہا بنے ہوئے ہیں" اُس نے کئی بار کہا۔

"بکو مت" بیٹے نے ڈانٹا اور کروٹ لے کر روٹھ گیا۔ اُس نے آنکھیں کھول کر یہ جازم یوں ہی تتی دیکھی تھی۔ اس کے دل میں اس کا احترام تھا۔ اُس کا اپنا وجود بھی اسی جازم کا مرہون منت تھا۔ اور پھر آخری دنوں میں جب خلیفہ کا چل چلاؤ تھا، تب بھی اُن کا ہاتھ خلیفن کے سینے پر نہ ہوتا تو انھیں نیند نہ آتی۔ کتنا تشکر تھا اُن کے ہاتھ کے مس میں! اور اب نہ الگنی تھی۔ اور نہ ہی جازم کے باہر پڑے ہوئے جوان بیٹوں اور بیٹیوں کے کھٹولے۔ چڑیاں دانا دُنکا چگ کر اپنے گھونسلوں میں جا چکی تھیں۔ نئی دُنیائیں بسائی تھیں۔ مگر خلیفن کا پنجرا سنسان پڑا تھا۔ کبوتر کو یم دوت اُٹھا کر لے گئے تھے۔ کبوتری تنہا پڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل پر کسی کا سہارا نہ تھا۔

• • •

خلیفن نے کھچڑی کی پتیلی بھوبل پر سے گھسیٹ کر پاس کر لی۔ اب کون سینی میں کھانا سجا کر ایک اپنی جان کے لیے لے جائے۔ چٹنی بھی نہیں پیسی۔ بڑے کو بڑی بھاتی تھی۔ گھی کی لُٹیا طاق پر رکھی تھی مگر انھیں ہاتھ بڑھا کر اُتارنے کی توفیق نہ

ہوئی۔ تیسرا روزہ تھا افطاری اُنھوں نے سب کی سب مسجد میں بھجوا دی تھی۔ دور دور کوئی اپنا نہ تھا۔ زینب اپنی سسرال گئی ہوئی تھی۔ کتنا کہا۔ گھٹنے جا رہی ہے۔ بچّی کی پڑھائی کا ہرج ہوگا۔ اسے میرے پاس چھوڑ جا۔ مگر کون چھوڑتا ہے اپنی اولاد کو۔ انسان کس طرح کلیجا پھاڑ کر پیدا کرتا ہے۔ اور پھر خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ دودھ چھٹا کر جب بچّے کو روٹی چاول پہ لگا دو تو پھر وہ ماں سے ایسے نہیں چمٹتا، اولاد بیاہ دو تو اُس کے اپنے بال بچّے، اُس کی ساری محبّت، سارا پیار ہے لیتے ہیں۔ بوڑھے کھوسٹ ماں باپ کے لئے کیا بچتا ہے؟ صحن میں مینھ کی جھڑی لگی تھی مگر خلیفن کی آنکھیں خشک تھیں۔

اُنھوں نے کھچڑی کی پتیلی چھینکے پر جوں کی توں اُٹھا کر رکھ دی۔ لوٹے سے ہاتھ دھو ڈالے۔ ایک رکابی وہ بھی چکنائی کی۔ دھونے میں کون سے ہل بیل لگتے ہیں۔ ہائے سی باورچی خانے میں کبھی برتنوں کا ڈھیر ہوا کرتا تھا۔ تین چار پتیلیاں چھوٹی بڑی آٹھ دس پلیٹیں، تانچے، کفگیر، تھالیاں، سینیاں مانجھتے مانجھتے کمر ٹوٹنے لگتی تھی۔ کیا پتہ تھا۔ ایک دن ــــــ ایک ہی پلیٹ رہ جائے گی، وہ بھی سوکھی!

دروازے پر زنجیر کھڑکی۔ "کون ہو سکتا ہے؟ ــ الٰہی خیر۔ . . . کہیں نا سن ہو۔ اولاد اللہ نے دور بھیجدی تو پھر ماتا کی رگ بھی مسل دی ہوتی۔ تیری بڑی قدرت ہے پروردگار!"

"کون ہے؟" اُنھوں نے پلیٹ طاق میں رکھ کر پکارا۔

"دروازہ تو کھولو۔ . . . میں ہوں محمد . . . کلّو کی ماں!"

"ارے یہ رات کے وقت!" اُنھوں نے سر پر بورا ڈال کر دروازہ کھولا۔ اور آڑ میں ہو گئیں۔

"کچھ ایسی ہی بات ہے . . ." محمد نے دروازے کے نیچے سر چھپاتے ہوئے مینھ سے بچنا چاہا۔

"اے مردوئے، کھڑا پانی میں بھیگ رہا ہے۔ منہ سے نہیں پھوٹتا، کیا بات ہے؟"

"وہ . . . . . وہ . . . . کوئی دائی کا پتہ مل جاتا تو . . . ."

qasarulkutub.blogspot.com

"وہ اوہو . . . تو یہ بات ہے چپ چپاتے بیاہ بھی رچا لیا اور ہمیں پتہ نہیں۔"

"یہ بات نہیں للّو کی ماں"، ویزاد محمد میاں نے بھیگی ہوئی مُردہ آواز میں کہا۔

"اے بھائی بیر رات کے گیارہ بجے بپتا آن دھمکی اور پہیلیاں بجھوانے آئے ہو۔ یہ کیا مذاق ہے؟"

"اب . . . اب تم سے کیا کہوں . . . بنّو . . . بنّو . . ."

"بنّو! . . . اوئی کون بنّو؟"

"میری لونڈیا۔"

"اچھا . . . اچھا بنّو . . . اوئی بنّو نگوڑی . . . اے مردوئے تیرا جیتا بگھل گیا ہے کیا؟ . . . ہے ہے، یہ سب باسط کے لونڈے کے کرتوت ہیں۔"

"دائی کا پتہ بتاتی ہو کہ . . . میں جاؤں . . . لونڈیا کا اتنے میں دم نکل چکا ہوگا۔" محمد میاں بولے۔

"ہے ہے . . . اب اس وقت دائی کا پتہ کہاں سے بتاؤں . . . . . . مستین کو باؤ گولے کا درد اُٹھا ہے۔"

"اسی کے ہاں سے آ رہا ہوں۔"

"تم کہاں رہو ہو؟"

"نانی نصان . . . مگر میں . . . میں نہیں چاہتا۔ اللہ دی بڑی حرامزادی ہے۔ سارے محلے میں پھونک دے گی۔ ویسے ہی رہنا دوبھر ہو رہا ہے . . . اب اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ جا کر حرامزادی کا گلا گھونٹ دوں۔" محمد میاں جلدی سے مُڑ لئے۔

"اے ٹھہرو میاں! یہ بھی کوئی طریقہ ہے . . . تم کہو تو میں چلی چلوں اور کیا . . . ."

"تم!"

"ہاں ایک سے دو اچھے ہووے ہیں . . . اور تم ٹھہرے مرد آدمی . . . کوئی سواری؟"

"اِکّہ ہے چھیدو کا . . . ."

برقعہ سر پر ڈال کر خلیفن نے جھٹ لالٹین بجھا، محمد میاں کو تالا پکڑا دیا۔ اور لپک جھپک دوڑیں اِکّہ کی طرف۔ تالا لگا کر محمد میاں بھی لپکے جلدی سے خلیفن کو سہارا دے کر خود اِکّہ ہانکنے لگے۔

"او چھیدو موا کہاں ہے؟"

"بیٹے ہوئے بڑا تھا۔ بہت سر مارا۔ پھر میں اِکّہ لے کر چلا آیا۔ سالے کو کرایہ بھی نہیں دوں گا۔"

اندھیری کوٹھڑی میں کالی بھجنگ چٹخی ہوئی چمنی کی لالٹین بھڑک رہی تھی اور کھٹولے پر تیرہ چودہ برس کی تنکا سی لڑکی سسکیاں بھر رہی تھی۔

"ہٹ میری لاڈو نہیں"، خلیفن کا جی بھر آیا۔ انھوں نے بچی کا منہ اپنے دوپٹے کے کونے سے پونچھا۔ پھر اپنے آنسو ضبط کر کے محمد میاں پر چلائیں۔

"کیا میری چھاتی پر کھڑے ہو کاٹھ کے الّو کی طرح۔ کوئی صاف ستھری چادر تو دو۔"

صاف ستھری چادر کا اس گندے سنڈاس گھر میں کیا ذکر، محمد میاں نے اپنی دھلی ہوئی تہمد نکال کر دی۔ دو ایک قمیض بنیان خلیفن نے سے لے پھر کواڑ بھیڑ کر انھوں نے بڑھ کر ایک طرف ڈالا۔ اور آستین چڑھا کر بچی پر جُٹ گئیں۔ گودڑ گھسیٹ کر ایک طرف ڈالا۔ دھلی تہمد موڑ کر آدھی اس کے نیچے بچھائی۔ پلنگڑی کو گھسیٹ کر سیدھا کیا۔

"اے کوئی دوسری لالٹین نہیں ہے؟"

"ہو گی کہیں کوٹھڑی میں۔"

"پھونک ڈالو۔ تم اسی کو صاف کر دو اور اس کی کوئی موم بتی دے دو۔" محمد میاں نے تیل کی کُپّی پکڑا دی۔ انھیں ہوش ہی نہ تھا کہ برقعہ نہیں اتارا ہے۔ محمد میاں کی آنکھیں نیچی رہیں۔ برآمدے میں ایک پانچ چھ برس کی لڑکی اور دو ننھے ننھے لڑکے سہمے ہوئے ٹکر ٹکر تک رہے تھے۔

"ان بچوں کو تو سلادو۔"

qesarulkutub.blogspot.com

”نہیں ہوتے حرامزادے“

”حرامزادے تو تم ہو ممد میاں جو لونڈیا کی یہ درگت بنوالی۔ اور آنکھوں کی چربی نہ پگھلی“

مارے غصے کے ممد میاں کا منہ لال پڑگیا۔ ایک دم پھٹ کر بولے ”چولہے میں جاؤ۔۔۔ غارت ہو۔۔۔ جو ہوگا میں خود دیکھ لوں گا۔ ہمیں تمھاری ضرورت نہیں“

”گھاس کھا گیا ہے مردوے، تو جنے گا؟“ خلیفن غرائیں۔

”تیری ایسی کی تیسی مردار۔۔۔ چل نکل یہاں سے۔۔۔“ ممد میاں گرجے۔

مارے غصے کے اُن کے آنسو بہنے لگے اور سارا جسم تھر تھر کانپنے لگا۔

”چل دور ہو موئے۔۔۔“ اُنھوں نے دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ اور ممد میاں سر پکڑ کر ہچکیوں سے روتے وہیں بیٹھ گئے۔ بچے بھی رونے لگے۔

کُپّی کی روشنی میں انھوں نے دیکھا، بچی کی آنکھیں چڑھ گئیں دانتی بھنچ گئی۔ اور ہاتھ پاؤں مڑ گئے۔

”ہائے میری بچی۔۔۔“ وہ دھاروں دھار روتی ہوئی اُسے سنبھالنے لگی۔

اُن کی چیخ سن کر ممد میاں نے دروازہ کوٹ ڈالا۔۔۔ بنو سخت جان عورت کی ذات درد سے کر پھر سنبھل گئی۔ اور اُنھوں نے ممد میاں کی سات پشتیں تول ڈالیں۔ بارہ خان کے بڑھوں کی قبریں کھود کر اُن کے سروں پہ سے کفن کھسوٹ لئے۔ مائی تھان اور دائی تھان کے رہنے والوں حتیٰ کہ آگرے کے باسیوں تک کو نہ چھوڑا۔ وہ روتی جاتی تھیں۔ سوکھی ماری تنکا سی لونڈیا دوہری ہو گئی۔

”نہ رو چندا۔۔۔ بس۔۔۔ ہاں ذرا پٹی پکڑے میری بیٹا۔۔۔ ہاں میری لاڈو۔۔۔ اوپر سانس نہیں کھینچ۔۔۔ ہاں۔۔۔ بس نیچے ہی نیچے۔۔۔ ان کے ہونٹوں سوتوں کی منت چلتے۔۔۔ دم گھونٹ کے۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ہا۔۔۔ آ۔۔۔ آں۔۔۔“

بچے میں دم نہ تھا۔ جیسے جھینگڑے کا گودا خلیفن نے لوٹا پوٹا۔۔۔ پیروں سے

جُھلایا۔ دو چار تھپکیاں دیں۔

”جئیں۔۔۔“ ننھی زندگی پکاری اور مارے خوشی کے خلیفن کے دوگنے آنسو بہنے لگے۔

”بیٹا ہے ماشاء اللہ۔۔۔“ دھڑ سے اُنھوں نے دروازہ کھول کر اعلان کیا۔ اُن کا منہ ہاتھ اور کپڑے خون میں لت پت تھے۔ ڈوپٹہ غائب۔۔۔ گوشت کی لال بوٹی کی طرف اُنھوں نے پیار سے دیکھا۔ اور ممد میاں کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کواڑ بھیڑ دیے۔ ممد میاں کی مسکراہٹ ایک دم کے لیے لپکی اور پھر بجھ گئی۔ خلیفن بھی کھسیانی رہ گئیں۔ مبارکباد کا بھلا کیا موقع تھا!

”ایک پیالہ دودھ ہوگا؟“ اُنھوں نے بچے کو نہلانے کے بجائے اپنے دُپٹے سے پونچھ کر ممد میاں کی قمیض میں لپیٹ کر بنو سے چھوٹے بھائی کو پکڑا دیا۔ بچے چاروں طرف بیٹھ کر حیرت سے اُس کیڑے کو دیکھنے لگے جو اُن کی چھوٹی آپو کے پیٹ سے نکلا تھا۔

بچوں کو سلا کر ممد میاں کی قمیض پہن کر اُنھوں نے ایک دُھلی ہوئی تہمد کا دوپٹہ بنا کر اوڑھ لیا۔ پیجامہ کا کیا ہے گھر جا کر بدل لیں گی۔ یوں تو باورچی خانہ تھا۔ جیسے بھتنے کی کنڈلی، نہ جانے کب سے ہانڈیاں پڑی سڑ رہی تھیں۔ ممد میاں کی بہو کے سلے جہیز کے برتن لنڈورے پڑے تھے۔

واپسی سحری کے وقت سے پہلے نہ ہو سکی۔ راستے میں ممد میاں نے اپنی بدتمیزی کی معافی مانگی۔ غلطی کچھ خلیفن کی بھی کم نہ تھی۔ ایسے موقعے پہ خلیفہ ہوتے تو لگاتے دو جوتیاں چوٹی پکڑ کے۔ بڑا چہیتا تھا مرنے والے کا۔

”مگر اتنا پھر بھی کہوں گی ممد میاں تمھاری کمزوری ہے“

”کیا کروں ککّو کی ماں!۔۔۔ لونڈیا کا باپ ہونا بھی قیامت ہے۔“

”مرد ہو کے مجھ سے پوچھتے ہو؟۔۔۔ وہ کوئی لاٹ کا بچہ ہی ہووے۔ میں تو چھاتی پہ چڑھ کے لہو پی جاتی۔“

اور سچ مچ خلیفن نے خون پی لینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ جب بنو میں ذرا دم آ گیا

qasarulkutub.blogspot.com

تو ایک دن وہ اپنی زرہ بکتر یعنی اپنا تازہ دُھلا برقعہ نکال کر پہنچیں۔ محمد میاں کے ہاں انہوں نے واحد میاں طولِ عمرہٗ یعنی بنّو کے لونڈے کو تیل مل کر نہلایا۔ یہ ڈھیر سا کاجل بڑی بڑی آنکھوں میں بھرا، نظرِ گزر سے بچانے کو ایک ٹیکا دائیں پیر کے تلوے اور دائیں گال پر لگایا۔ سرخ گرنٹ کا کرتا، جس میں بیلی مغزی لگی تھی، پہنا کر اور دوہری جھالر کا کنٹوپ پہنایا۔ موئے اُنھوں نے بساطی کی دوکان پر جاتے جاتے خرید لئے تھے۔ بنّو کو اُنھوں نے گلابی غرارہ کُرتا، اور فیروزی چُنا ہوا دوپٹہ اُڑھایا۔ نگوڑا کھا بھی تھی کتنی جو رقعہ اوڑھتی، اُنھوں نے ململ سی چادر سر سے پیر تک لپیٹ دی جو اُس کی موتیوں کی گرگابی تک پہنچ رہی تھی۔

اور یوں قافلہ چلا۔ آگے آگے فیلڈ مارشل یعنی خلیفن برقعے کا نقاب منہ پر منڈھے اُن کی کھوٹتی سی ناک کنارہ بنی، گود میں واحد علی خاں ولد واحد علی خاں ولد باسط علی خاں، سپرنٹنڈنٹ پولیس ساکن مائی تھان، پیچھے اُن کے واحد علی خاں کی مختصر سی والدہ ماجدہ اور اُن کے پیچھے محلے کے لونڈوں اور لینڈی کُتّوں کی فوج۔ خلیفن نے حویلی پر چڑھائی کر دی۔

دربان "نا، نا" کرتا ہی رہ گیا۔ اور وہ ایک جھپاکے میں غڑاپ سے بنّو کا ہاتھ پکڑ کے اندر، دربان کُتّوں اور گلی کے بچّوں سے جوجھتا رہ گیا۔ اندر سپرنٹنڈنٹنی برآمدے میں تخت پر بیٹھی تازہ اخبار "تہذیبِ نسواں" کا مطالعہ کر رہی تھیں۔ صاف سُتھری چوکیوں پر چِٹّی چاندنی کسی تھی جس پر گاؤ تکیہ اور گاؤ تکیئے کی ہم شکل بیگم سجی ہوئی گوبھی کی کھیر کی ترکیب پر غور کر رہی تھیں۔ شکر دیکھ کر اُن کی جڑی بھنویں کنکھجورہ بن گئیں۔

دندناتی آتو گئیں خلیفن، پر ایک دم جی پہ پولیس کی بیگم کی دہشت بیٹھ گئی۔ نقاب اُلٹ کر ہکلائیں "سلام . . . . بیگم صاحب . . . . اری بنّو، ساس کو سلام کر نگوڑی،" اُنھوں نے سنبھل کر حکم دیا۔

سوکھا مارا نزار ہاتھ ماتھے پہ لگا کر بنّو دوہری ہو گئی۔ چادر کے گھونگھٹ میں اُس کے لرزتے ہوئے آنسو جذب ہوتے رہے۔

"کیا ہے خلیفن؟" بیگم نے ترشی سے کہا۔ اُنھوں نے اُن سے بیٹھنے کو بھی نہ کہا تکئے سے لگی، عینک اُتار کر گھورنے لگیں۔ مگر خلیفن قلعے کے اندر پہنچ کر شل ہو گئی تھیں۔ دھم سے بیٹھ گئیں۔

"اری بیگم پوتا مبارک ہو" اُنھوں نے رنگ برنگی پوٹلی بیگم کی گود میں دھر دی۔ بیگم ایسی بدکیں جیسے کسی نے دہکتا انگارہ گود میں ڈال دیا ہو۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اُنھوں نے جلدی سے پوٹلی اپنی گود سے الگ رکھ دی، "نکل جاؤ کمبختو . . . . . سپرنٹنڈنٹ صاحب گھر پہ نہیں ورنہ تھانے پہنچا دیتے۔"

"اے بیگم! . . . . کیسا پتھر کا کلیجہ ہے تمھارا" اُنھوں نے بچے کو چھاتی سے لگا کر کہا۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ . . . بھاگ جاؤ تم لوگ . . . . . ارے او مسیتا! ذرا دیکھ تو میاں پنڈت جی کی طرف ہو نگے۔ لپک کر بلا تو لا . . . ."

"ہاں ہاں بلوا لو دادا جان کو بھی، پوتے کو دیکھ کر کلیجا ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

"بس بس، زیادہ چبڑ چبڑ نہ لگاؤ خلیفن بُوا . . . . . یہ پِلا اُٹھاؤ اور باہر نکلو۔"

"اے ہے، اس ننھی سی جان کو پلا کہہ رہی ہو، ذرا دیکھو تو بیگم۔ بالکل کھلونا ہے۔"

"اے تو ہم کیا کریں . . . ."

"ارے کلیجے سے لگاؤ اور کیا کرو . . . . اللہ نے یہ دن دکھایا۔"

"مطلب کیا ہے تمھارا؟"

"مطلب یہ کہ بیگم صاحب، اتنی ننھی تو بنّو غریب کی لونڈیا مٹی کی گڑیا نہیں کہ چار دن کھیل کے ٹھکرا دیا۔ ہاتھ پکڑا ہے تو صاحبزادے کو نبھانا ہوگا۔"

"مگر خلیفن . . . . واحد میاں نے تو ابھی میٹرک بھی نہیں کیا . . . . . اللہ رکھے بی اے کریں گے . . . . ولایت جائیں گے تب شادی وادی بھی ہو رہے گی۔" جب تک کہاں آئیں؟ بیگم نے سوچا ذرا نرمی سے بات ہو جائے۔

"ہاں ہاں بیگم بس یہ کب تک چلے گا میاں پڑھنا چھوڑ دیں . . . ."

"اور پھر میں تو اپنی نند کو زبان دے چکی ہوں" اُنھوں نے دبی زبان سے کہا۔

"نند کو زبان دے چکی تھیں بیگم تو لونڈے کو گلے میں رسّی ڈال کے رکھا ہوتا کہ بے نتھا بیل دوسروں کی کھیتیاں نہ کچلتا پھرے۔ جا بیوی، وہ زمانے لد گئے۔"

qasarulkutub.blogspot.com

خلیفن پھر گرم ہوئیں۔ ایک دم ننھو پر برس پڑیں "اری نامراد، کیا ٹسوے بہا رہی ہے اُٹھ کر اس کے پیر پکڑ لے" اور ننھو تو جیسے منتظر ہی تھی گرنے کی۔ تیورا کر بیگم کے قدموں پر گر گئی۔ ننھے ننھے سوکھے مارے ہاتھوں سے موٹے چکنے پیر پکڑ کر اُن پر ماتھا ٹکا دیا۔

بیگم کے جیسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ جھٹکا دیا تو ننھو وہ جا کر سلفچی پر گری۔

"اے ہے چڑوا، تیرا ستیاناس ہو۔ اُجڑی لونڈیا کے جگہ بے جگہ چوٹ لگ جاتی تو؟"

"اری خیرن۔۔۔ باقر۔۔۔ اللہ دی۔ ذرا لینا اس حرامزادی کو۔ نکالو تو اسے جوتیاں مار کے۔۔۔۔"

"جوتیوں کی بچی، حرامزادی تو اور تیری سات پشتیں۔ بڑی لاٹ صاحب کی بچی آئی کہیں سے۔ چونڈا پکڑ کے اتنی جوتیاں لگاؤں گی کہ باوا کا نام بھول جائے۔۔۔"

شیرنی کی طرح خلیفن گرجیں۔ ننھو اور اُس کا بچہ چلا چلا کر رونے لگے۔

"ارے یہ کیا قصہ ہے۔۔۔؟" سپرنٹنڈنٹ صاحب گرجے۔ یہ ڈبل ڈول پہ بڑی بڑی مہندی رچی ہوئی مونچھیں۔ گول انڈا سی تونڈ، چست پاجامہ اور باریک لکھنؤ کی چکن کا کرتا پہنے، شکاری ہیٹ گرمی سے بچنے کو لگا لیا تھا۔ عجیب تو بچھیوں کی سی شکل کے لگ رہے تھے۔ کبھی بڑے حسین ہوں گے۔ اب تو پھٹکار برسنے لگی تھی۔

"سلام میاں۔۔۔۔"، خلیفن پھر لچک گئیں۔

"سلام خلیفن بُوا۔۔۔ کہو، اچھی تو رہیں؟ پولیس والے بڑے ہشیار ہوتے ہیں۔"

"آپ کی دُعا ہے سرکار۔"

"بیگم کھانا تیار رہے ہے"، اُنھوں نے نرمی سے خلیفن کو ٹالنا چاہا۔ تہذیب زبان میں اُس کا مطلب ہے، آپ تشریف لے جائیے۔ کیونکہ کھاتے وقت صرف ذرا سے روٹی کے ٹکڑے کی آس میں ٹھہر جاتے ہیں مگر خلیفن کو کون ٹال سکتا تھا۔

"اے قربان جاؤں سرکار کے، کیا واد جان کو منہ مٹر دیکھ رہے ہیں۔ واحد میاں آنکھیں تو سرکار بالکل آپ کی جیسی نرگسی ہیں۔"

"بیگم، یہ کیا بکواس ہے۔۔۔" باسط میاں کے ہاتھ کی لرزش چھپائے نہ چھپی۔

"مجھ سے پوچھئے سرکار۔۔۔ یہ ننھو آپ کی بہو۔۔۔ حماد میاں کی لونڈیا۔۔۔ واحد میاں۔۔۔"

"خاموش۔۔۔ بدتمیز۔۔۔ کیا ثبوت ہے تمھارے پاس؟"

"سرکار، سارا محلہ گواہ ہے۔ آپ کے ڈر سے کوئی بولتا نہیں۔"

"محلہ گواہ ہے؟۔۔۔ سچی بات ہوتی تو سب ہی کہتے، کیا میں نے اُن کا منہ بند کیا ہے؟"

"سرکار، آپ سے کوئی بھید نہیں چھپا۔۔۔ یہ واحد میاں کلہ ہے۔۔۔ صورت دیکھئے یہ پھوٹی آنکھیں کہاں چھپیں گی، ابھی سے پولیس والوں کی طرح اکڑ رہے ہے" اُنھوں نے بچے کو باہوں میں جھلا کر کہا "سرکار رحم کیجئے اس ننھی سی بچی پہ سوچئے میاں، اس کا کیا ہوگا۔۔۔ اسے کون لیوے گا۔۔۔ حماد میاں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔۔۔"

"اوّل تو تم بکتی ہو، واحد میاں ایسے گئے گزرے بھی نہیں کہ موریوں میں ناک رگڑتے پھریں۔ دوسرے وہ ابھی پڑھ رہے ہیں۔ اور پھر اُن کی عمر ہی کیا ہے؟"

"پڑھنے کو کون روکتا ہے میاں، جم جم پڑھیں۔ اور میاں بچہ پیدا کروانے کے لائق ہیں، پڑھنے کو ابھی چھٹنڈولے ہی ہیں۔"

"بکواس مت کر۔۔۔" سولہ سترہ برس کے واحد خاں اوپر روشن دان سے آنسو بھری آنکھوں سے یہ ڈراما دیکھ دیکھ کر کانپ رہے تھے۔

"میاں ذرا سوچئے آپ اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیں۔ اس کی عزت رہ جائیگی۔ آپ کے عروج کو دعائیں دے گی۔ ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ دو روٹیاں تو آپ کے کتے بھی کھا لیتے ہیں۔" اُنھوں نے لرزتی ہوئی ننھو کو گھسیٹ کر آگے کر دیا "اس کی صورت دیکھئے سرکار۔"

"ہم اپنی بہن کو زبان دے چکے ہیں خلیفن۔" سوکھی ماری ننھو کی طرف آنکھ

dasaulkutub.blogspot.com

اُٹھانے کی اُن کی ہمّت نہ ہوئی۔

"لو سرکار، شرع میں تو چار کی اجازت ہے۔۔۔۔" واحد میاں شوق سے بھوپالی کی بیٹی بیاہ لائیں۔"

اب تو باسط خاں کا پارہ چڑھنے لگا۔ پُرانی تعلقے داری کی رگ اُبھر آئی۔ اُنھوں نے نوکروں سے کہا، "دھکّے دے کر نکال دو سالی کو۔"

بس گالی کا سُننا تھا کہ خلیفن جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑیں۔

"تیری ایسی کی تیسی حرام خور، دغا باز۔" اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، گریبان پکڑ کر چپٹی جوتی اُتار تڑ تڑ چار پانچ رکھ ہی دیں۔ باسط خاں نے جھنجھلاتے ہوئے ریچھ کی طرح اُنھیں جھٹکا، مگر اُنھوں نے باؤلی کتیا کی طرح دانت گاڑ دیے، کُرتا چیر چیر کر ڈالا، مونچھیں کھسوٹ ڈالیں۔ ایسی مردمار تو کبھی نہ تھیں، پر آج اُن پر جانو مرگھٹ کی بھتنی سوار ہو گئی تھی۔

ہونا کیا تھا۔ دھکّے دے کر حویلی سے نکال دی گئیں۔ بچّے کی پوٹلی دبائے وہ لمبے لمبے ہاتھ چلا کر باسط خاں اور ساری پولیس فورس کو مغلّظات سنا رہی تھیں۔

"اے محلے والو! ڈوب مرو۔۔۔۔ ارے یہ سپوونٹ ہے کہ شیطان۔۔۔۔۔ اس کا لونڈا پرائی بچیوں کی عزت مٹّی میں ملائے۔۔۔ اُنھیں پیٹ رکھائے۔۔۔ اور تم ہیجڑوں کی اولاد کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے۔۔۔ ارے ایک دن تم سب کی جوروئیں، بیٹیاں، پوتیاں، نواسیاں بہکائے گا۔" اُنھوں نے کھڑکیوں، دروازوں میں سے جھانکتے ہوئے لوگوں سے کہا، "ہے ہے، چوڑیاں پہن کے گھروں میں گھس جاؤ، بیوی کے لہنگے تلے۔" اُنھوں نے لالہ جی کو دروازے کی آڑ سے چوہے کی طرح جھانکتے دیکھ کر پکارا۔ بے چارے نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

محمد میاں گھر میں سر پکڑے بیٹھے تھے۔ خلیفن نے اُنھیں کہیں کا نہ رکھا۔ محلے میں سر اُٹھا کر چلنا دوبھر ہو جائے گا۔ ہنکارتی ہوئی جب وہ بچّے اور بنّو کو لے کر پہنچیں تو اُن کے پیچھے لونڈوں کی ڈھیری نہیں لگی ہوئی تھی۔ بچّے اُنھیں ایسے دیکھ رہے تھے جیسے وہ پورس کی طرح سکندرِ اعظم کے دربار میں مُنہ توڑ جواب دے کر آئی ہوں۔

"ارے خلیفن بُوا کی ہمّت تو دیکھو، سپوونٹ صاحب کی مونچھیں اُکھاڑ ڈالیں۔" مگر محمد میاں کا جی چاہ رہا تھا کہ خلیفن کو جا کر تھوک دیں موری میں۔ مگر اس سے پہلے کہ محمد میاں اُن پر حملہ کرتے، وہ بپھری شیرنی کی طرح اُنھیں پہ برس پڑیں۔ برقعہ اُتار کر اُنھوں نے اُن کے مُنہ پہ دے مارا۔ "لو۔۔۔ یہ برقع پہن کر نکلنا آج سے۔"

"بس خلیفن، بہت ہو لیا۔ اب سیدھی طرح اپنے گھر کا راستہ ناپو۔ میری زندگی میں ویسے کون سی بہاریں تھیں جو اور تم نے کانٹے بو دیے۔ سپرنٹنڈنٹ ہے خالہ جی کا داماد نہیں۔ کوئی الزام لگا کر چکّی پسوا دے گا اور میری ٹال میں آگ لگا دے گا سو الگ۔ نہ جانے کون منحوس گھڑی تھی جو تم سے پالا پڑا۔۔۔ اس سے تو یہ بے حیا رنڈی مر گئی ہوتی۔" اُنھوں نے بنّو کو ایسا رہپٹ لگایا کہ وہ جا کے گری اوندھے مُنہ۔

"خبردار جو تم نے لونڈیا پہ ہاتھ اُٹھایا۔ مارنا ہے تو مجھے مارو بنّو کے باپ۔۔۔ قصور میرا ہے۔۔۔ آگ لگے میری زبان کو۔۔۔ میں نے تو لونڈیا کے بھلے کو یہ فضیحتا مول لیا۔" اُنھوں نے بچّہ بنّو کی گود میں دے دیا اور بڑی پٹائی شکل لئے چل پڑیں اپنے اجاڑ گھر کی طرف۔

سارا دن خلیفن روزے میں تھکی ہاری کھری چارپائی پر پڑی دھاروں دھار رویا کیں۔ اُنھیں افطار کی بھی فکر نہ تھی۔ وہ سچ مچ جلتی تو اتنی بے بسی کی گانٹھ جس پر انھیں ہاتھ ڈال دیں اس کا کباڑا ہو جائے۔ سچ تو ہے جو ہونا تھا ہو چکا۔ چُپ چاپ کہیں بنّو کو کوئی بڈھا ٹھڈا ہی جو مل ہی جاتا، مگر اب جو یہ ٹھڑی پٹ گئی تو کوئی تھوکے گا بھی نہیں۔ پھر پولیس والے ہوتے ہیں ذرا بسیلے، بھیّو، باسط خاں کے ڈنک سے بچنا مشکل ہے۔ آج خلیفن کو اپنے بڑھاپے کا یقین ہو گیا۔ اسی زبان کی خاطر بہو داماد سے نہ بنی۔

عصر کی نماز پڑھ کر سلام پھیر رہی تھیں کہ آہستہ سے کُنڈی کھڑکی۔ "یا علی۔۔۔ یا پیر دستگیر۔۔۔ اے مولا، بارہ اماموں کا صدقہ، پولیس چوکی کا آدمی نہ ہو۔ اے خدا رحم۔۔۔" کانپتے لرزتے ہاتھوں سے کُنڈی کھولی تو کوئی نظر نہ آیا۔ اطمینان کا سانس لے کر بند ہی کرنے والی تھیں کہ واحد میاں بھیگی بلّی بنے دیوار کے پاس سکڑے نظر آئے۔

qasrulkutub.blogspot.com

"ہائیں خیر" بوا کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔
"کیا کام لڑکے؟" اٹک کھانسی سے بولیں۔

واحد میاں نے نیچی نظریں [illegible] کی طرح ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔

"اندر آ جاؤ بیٹیا" بوا [illegible] نرم پڑ گئیں۔

واحد خاں پلنگ کی پٹی پر جھکا کے بیٹھ گئے۔ آستین سے پیشانی کا پسینہ پونچھ کر بولنا چاہا، مگر گلے میں آواز گھٹ گئی۔ آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو نکل پڑے۔

"مرد بچے ہو کر روتے ہو۔ اس بدبخت کا تو خیال کرو۔ ذرا سی بچی پر کیا بیت گئی۔ میرا تو کلیجہ شق ہوا جاتا ہے۔ کچی عمر کے جاپے [illegible] گی۔ بڑے ہو جاؤ گے، تب پتہ چلے گا۔ میاں تمہارا کیا بگڑا؟ ماشاءاللہ [illegible] ندھن جاؤ گے، دولہا بنے گھوڑی پر چڑھ کر نواب زادی بیاہ لاؤ گے۔"

"نہیں بوا... میں سنکھیا کھا لوں گا" واحد میاں کی ہچکی بندھ گئی۔

"تف ہے تمہاری اوقات پہ... تم مرے سے قبر میں جا لیٹو گے اور وہ تمہارا گناہ چھاتی سے لگائے گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرے گی۔ کیا بھولا سا ہے واجد... باپ کی شکل ہے ماشاءاللہ" واحد کے کان سرخ ہو گئے۔ کمسن باپ جس کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں، نامعلوم سے غرور سے مسکرا پڑا۔ مگر دوسرے لمحے پھر ہونٹ کانپنے لگے۔

پھر نہ جانے کیا ہوا... بوا کو تو فرصت نہ تھی اپنے ہی آنسوؤں سے۔ محلے میں افراتفری پڑ گئی۔ رنگ ماتی نشان میں مسجد کے سامنے پولیس کی چوکی لگ گئی۔ محلے کے شہدوں نے سپرنٹنڈنٹ کا مکان جلانے کی کوشش کی۔ مسجد میں بعد نماز مغرب بڑی ہڑبونگ مچی۔ ملاجی تو فتویٰ دیتے تھے کہ دونوں کو سنگسار کر دینا چاہیے۔ شرع شریف کا یہی حکم ہے۔ پر محلے کے نوجوانوں نے ہلڑ مچا دیا۔ ان چھوکروں کو تو بس دنگے فساد کے لیے کوئی بہانہ چاہیے۔ ذرا سی بات پر لال جھنڈیاں لے کر طوفان مچانے لگتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں باسط خاں کا پتلا بنا کر چوراہے پر جلا دیا گیا۔ کسی سر پھرے نے رائے دی۔ کیوں نہ حویلی کو ہی پھونک دیا جائے۔ بات بڑھی، پولیس آ گئی۔ لاٹھی چارج ہوتے ہوتے بچا۔ بات اوپر تک پہنچ گئی۔ دو چار اخباروں نے بھی اس

لطیفے سے فائدہ اٹھایا اور نہایت سنگین قسم کے کارتوس نکل گئے۔ بیرکو اشارے سے پہلے ہی سپرنٹنڈنٹ صاحب محمد خاں کے دروازے پر کنڈی کھٹکھٹانے پہنچ گئے۔

"خلیفن جانیں، میں کچھ نہیں جانتا..." محمد خاں نے صاف کہہ دیا۔ اندر دروازے میں بوکھلائی برقعے کا پرچم اٹھائے بیگم بھی اتنے میں پہنچ گئی تھیں۔

"محمد بھائی، جو ہونا تھا ہو گیا، قاضی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہیے" بیگم جھینپ کی آڑ میں کہہ رہی تھیں۔

"میں نے کہہ دیا کہ خلیفن جانیں... میں کون ہوتا ہوں بیچ میں بولنے والا"

خلیفن نے جاتے ہی مورچہ سنبھال لیا۔ جھٹ سے چارپائی پر دری اور چادر بچھائی، ایک ٹین کی کرسی باسط خاں کی طرف بڑھائی۔

"ہاں صاحب، دیر کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی دم میں قاضی صاحب آتے ہوں گے۔"

"ارے نیک بخت، کچھ شربت وربت کا تو انتظام کرو" انھوں نے محمد میاں کو ڈانٹا۔ نکاح کے بعد سب محلے کے معززین نے مل کر روزہ افطار کیا۔

محلے کے وہی لفنگے جو گھڑی بھر پہلے باسط خاں کی ارتھی جلا رہے تھے، باسط خاں زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔ باسط خاں کو صرف ایک شکایت تھی کہ پوتے کا نام خلیفن نے بد ذاتی میں واجد خاں، اُن کے اپنے باپ کے نام پر رکھا حالانکہ واحد میاں کے بیٹے کا نام ساجد عرصہ ہوا طے پا چکا تھا۔ خیر اب انشاءاللہ عقیقہ پر ساجد ہی نام رکھا جائے گا۔

خلیفن دانت نکوسے لپ جھپ سب کی خاطریں کر رہی تھیں، دوڑ دوڑ کر سب کو شربت کے گلاس بانٹ رہی تھیں۔ گلی میں بدمعاش لونڈے شربت کی کٹوریاں پی پی کر نعرے لگا رہے تھے "خلیفن زندہ باد"

"اے چپ رہو حرام خورو!" خلیفن شرما کر [illegible] کھجوریں اور نان خطائیاں بانٹ رہی تھیں۔

پھر ایک معرکہ اور محمد میاں نے خلیفن کی چوکھٹ پر سر کیا۔ جا کر انھوں نے کنڈی کھٹکھٹائی۔ اور بالکل جیسے کوئی پڑوسن سے لون مانگنے، خلیفن کی خدمت

qasarulkutub.blogspot.com

میں نکاح کا پیغام پیش کر دیا۔ پہلے تو منہ پھاڑے خلیفن بھونچکی سی رہ گئیں۔
پھر جو بپھری ہیں تو خدا کی پناہ!

"حرام زادے، کلموہے، اچرکٹے، چیچڑ ننانی... ارے تجھے ڈھائی گھڑی کی آئے... تجھے طاعون سمیٹے۔ تیری میت اُٹھے..." پھر جو جوتی لے کر پلی ہیں محمد میاں پہ تو بلیتیں نکال دیں۔ مگر محمد میاں نرے محبوب پہ گردن کٹانے کا تہیہ کر کے آئے تھے، جوتیوں اور گالیوں کی بوچھاڑ کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ اندر آ گئے۔ وہ جوتیاں برسا رہی ہیں۔ محمد میاں کہنیوں سے وار روکتے جا رہے ہیں اور اظہار عشق بھی کرتے جا رہے ہیں۔

"اری سن تو نیک بخت... اری... خلیفن... تجھے... میری قسم... میری بات تو سن... رات کو... نیند نہیں آتی..."

"اے تو جا، قبر میں موئے... تجھے ہیضہ لے جائے۔"

"نکاح کر رہا ہوں،... کوئی بری نظر نہیں ڈالی۔"

"اے ہے، اُٹھائی گیرے... ڈھونگی... تو بری نظر ڈالے گا... تیرے دیدے نہ پھوڑ دوں گی... میری خدمت کا تو نے یہ پھل دیا ہے... کمینے... نکل... نکل میرے گھر سے۔"

"بس جی بس... بڑھتی ہی چلی جاتی ہو۔" محمد میاں نے ہاتھ مروڑ کر جوتی چھین کر الگ پھینکی۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"قصور؟... قصور تو میرا ہے... بدمعاش، کہ تیرے لئے نخلے بھرے جھگڑا کیا۔ تیرے بچوں کو اپنا سمجھا۔" خلیفن کا گلا بھر آیا۔

"تو جب اپنا سمجھا ہے تو چل کے سنبھالو کمبختوں کو..." محمد میاں گھگھیائے۔

"بھیڑ ہی مرغے کی ایک ٹانگ... میں تیرے بچوں کی لونڈی ہوں موئے... چل دور ہو..." وہ دور ہٹیں۔

"لونڈی ہو کر بیگم... اب تو تم ہی سب کچھ ہو..." محمد میاں اُن کی

طرف کھسکے۔

"ارے جا میاں... گھاس کھا گیا ہے... خبردار جو تو نے ایک قدم بڑھایا..." وہ پیچھے ہٹیں۔ مگر محمد میاں بڑھتے ہی چلے گئے۔

"موئے جاتا ہے کہ نہیں..." خلیفن سہم کر دیوار سے چپک گئیں۔

"نہیں خلیفن!... جی کرے تو مار ڈال... پر اللہ قسم... اب صبر نہیں ہوتا۔" ٹھنڈی آہ بھر کے محمد میاں بالکل ہی سٹ گئے۔

"ہے ہے موئے... بے شرم..." خلیفن کی آواز گھٹ گئی۔

"دل پہ قابو نہیں خلیفن... قرآن قسم..." اور محمد میاں نے لالٹین کی بتی تیل میں اُتار کر بجھا دی۔

رات کے دو بجے مسجد سے نکاح کر کے نکلے اور محمد میاں خلیفن کو اکے پر بٹھا کر لے چلے تو اُن کے دانت مونچھوں میں بکھرے جا رہے تھے جیسے وہ نئی دلہن بیاہ کر لے جا رہے ہوں۔ خلیفن بھی کنواری لونڈیا کی طرح کانپ رہی تھیں۔

"سچ بتاؤں خلیفن... جب پہلے دن بنو کی زچگی میں تم نے مجھے گالیاں دی تھیں نا، میں نے فیصلہ کر لیا تھا... پر تم بھی تو مجھے چاہنے لگی تھیں۔"

"اے ہے توبہ! خدا نہ کرے۔" خلیفن بھنائیں۔

"اب ہم سے جھوٹ نہ بولو۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ بھلا تمہاری نیت صاف ہوتی تو میرے دل میں کھل کیوں آتا؟" محمد میاں نے جرح کی۔ خلیفن بوکھلا گئیں۔

"تجھ پہ خدا کی سنوار..." انہوں نے حلق میں موٹی سی گالی دبا کر کہا۔

اگر قسمت نے محمد میاں کو اُن کا خدائے مجازی نہ بنا دیا ہوتا تو وہ اُن کی سات پشتوں کو مزے بھنتیں۔

qasarulkutub.blogspot.com

"میں تو بچوں کی وجہ سے . . . . ." وہ چپ ہوگئیں۔

"بچوں کی اتنی فکر ہے ظالم! اور بچوں کا باپ آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔" ممدو میاں نے کہنی سے خلیفن کا گھٹنا دبا کر کہا۔

"دُنیا کیا کہے گی؟"

"ارے گولی مارو سالی دُنیا کو!" ممدو میاں نے چابک پھٹکارا۔ اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

"مجھ کو آپ سے بہت دِن سے تعلق تھا" وہاب چچا کی دولہن نے گبھرا کر لونڈے کو ایک گھٹنے سے دوسرے پہ ٹھسکا۔

"اے ہوگا بھاڑ کی بات سے" نو بیوی نے اکتا کر بات کی کتر نوڑی اور کتھا چونا لگانے لگیں۔ دور کہیں کوئی اکیلا جھولا الاپتا ہوا بنی شاہی کی طرف جا رہا تھا۔ "عشق پر زور نہیں..."

اور خلیفن اندھیرے سارے جھوٹے برتن سامنے رکھے جھما جھم مانجھ رہی تھیں۔ دو سیر آٹا ٹھونک کے موٹے ٹھوں میں بیٹھا بیٹھا ورد پڑھ رہا تھا۔ ممدو میاں حقہ پیتے میں مونچھوں ہی مونچھوں میں مسکرا رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں گستاخ شرارت تھی۔

رات کو جب ممدو میاں اپنا بھاری سیاہ ہاتھ ان کے دل پر رکھ کر غافل سو رہے تھے تو خلیفن جاگ رہی تھیں۔ جاجم کے نیچے سوئے ہوئے بچوں کی میٹھی سانسیں ان کے کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ اُنھیں ایسا معلوم ہوا۔ وہ بڑے چھتنار درخت کے شرنی سائے میں لیٹی ہیں اور اُن کی گود میں میٹھے میٹھے پھل برس رہے ہیں۔

ختم شد

qasarulkutub.blogspot.com